قیمت: چار روپے

ملی ٹائمز انٹرنیشنل
نئی دہلی

اُردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

یوم سرسید کے موقع پر
خصوصی گوشہ

بٹنے لگی اب بی جے پی

کے کیمپ میں جوتوں میں دال
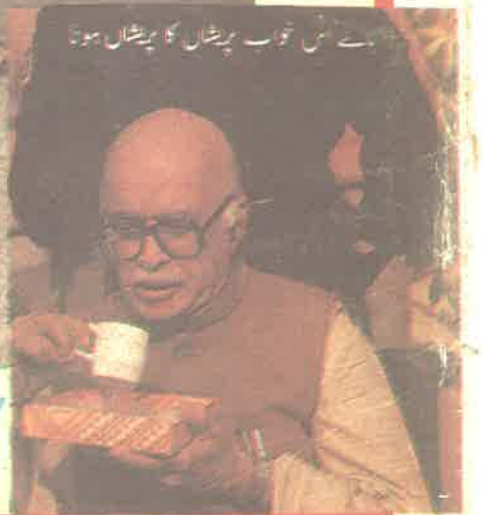
کیا اب مرکز کی طرف بی جے پی کے بڑھتے قدم رک جائیں گے؟

Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price	Country	Price
AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D. KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRI LANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$ 3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	60p
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	$1.25

دلتوں کے قبول اسلام کے اعلان سے ہندو تنظیموں میں بوکھلاہٹ

آر ایس ایس - وشو ہندو پریشد اور ہندو منانی دلتوں کو فرقہ وارانہ تشدد میں جھونک دینے کے درپے

تامل ناڈو کے چدمبرنار ضلع کے پچاس سے زائد گاؤوں میں زبردست کشیدگی ہے۔ لوگ خوف و ہراس میں مبتلا ہیں اور محفوظ جائے پناہ کی تلاش کر رہے ہیں۔ جن کو کوئی دوسرا علاقہ نسبتاً محفوظ نظر آتا ہے وہ اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر وہاں جارہے ہیں۔ یہی صورت حال کٹابومنار ضلع کے دیہی علاقوں میں ہے۔ وہاں بھی لوگوں میں خوف و دہشت کا ماحول ہے۔ اس ضلع کے تقریباً بیس ہزار افراد محفوظ مقامات پر منتقل ہوگئے ہیں۔ مزید انخلاء کی تیاری کر رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی نے دونوں اضلاع کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اگر ان اضلاع کے دیہی علاقوں میں فرقہ وارانہ تشدد پھوٹ پڑے تو حیرت کی بات نہیں ہوگی۔

دراصل یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوگئی ہے کہ دونوں اضلاع میں میناکشی پورم کی تاریخ دوہرائی جارہی ہے۔ جہاں 1981ء میں دلتوں نے بڑے پیمانے پر قبول اسلام کیا تھا۔ اور جس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں ایک تہلکہ برپا کردیا تھا۔ وہی حالات مدراس کے چدمبرنار اور ترونیلویلی کٹابومنار اضلاع میں بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ 60 ہزار سے زائد دلتوں نے قبول اسلام کی دھمکی دے دی ہے جس نے ہندو تنظیموں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس اور ہندو منانی کی جانب سے کسی بھی قیمت پر قبول اسلام کے واقعہ کو روکنے کی کوشش ہورہی ہے۔ حکومت بھی نہیں چاہتی کہ دلت اتنے بڑے پیمانے پر مشرف بہ اسلام ہوں۔ اسی لئے جہاں ایک طرف ہندو تنظیموں کا دورہ شروع ہوگیا ہے وہیں حکومت نے بھی وفود بھیجے ہیں۔ یہ تمام لوگ دلتوں کو اسلام قبول کرنے سے روکنے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں۔ باوثوق ذرائع کے مطابق ہندو تنظیموں کے رضاکار ان دلتوں کو دھمکیاں بھی دے رہے ہیں اور ڈھکے چھپے انداز میں یہ باور کرا رہے ہیں کہ ابھی تو ان کے صرف گھروں اور جائدادوں کو ہی تہس نہس کیا گیا ہے اگر یہ لوگ اپنے مجوزہ اقدام سے باز نہیں آئے تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ان سرگرمیوں اور وفود کی آمد و رفت سے علاقے میں زبردست کشیدگی اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوگیا ہے۔ جو لوگ ابھی محفوظ مقامات پر نہیں گئے ہیں وہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ انتہائی شکوک و شبہات اور عدم تحفظ کے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ وزیر اعلی جے للتا نے چند دن پہلے وزراء اور افسران پر مشتمل ایک ریلیف ٹیم بھیجی ہے جس کا کام طبقہ وارانہ تشدد میں متاثر ہوئے لوگوں کی امداد کرنا ہے لیکن جب یہ وفد ان علاقوں میں پہنچا تو متاثرہ دلتوں نے ان سے سخت گیر انداز میں سوال کیا کہ آپ لوگ آج آئے ہیں۔ ہم تین مہینے سے یہ اذیت جھیل رہے ہیں۔ ہم پر مظالم توڑے جارہے ہیں، ہمارے گھروں کو اجاڑا جارہا ہے اور ہمیں اس سے بھی بھیانک سبق سکھانے کی دھمکی دی جارہی ہے لیکن ابھی تک آپ لوگوں کا پتا نہیں تھا اب آپ کے آنے سے کیا فائدہ؟ وزیر اعلی نے آئی اے ایس افسران کی ایک ٹیم بھی ان گاؤوں میں بھیجی ہے۔ تمل ناڈو شیڈولڈ کاسٹ شیڈولڈ ٹرائب ایسوسی ایشن کی ایک تحقیقاتی ٹیم نے بھی متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حکومت دلتوں کے مسائل پر مگرمچھ کے آنسو بہارہی ہے اس کو ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ایسوسی ایشن نے دلتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ **حکومت کے** جھوٹے وعدوں پر اعتبار نہ کریں اور نہ ہی دھارمک تنظیموں کے جھانسے میں پھنسیں۔ گویا دلتوں کی ایسوسی ایشن نے بھی قبول اسلام کو ہری جھنڈی دکھادی ہے۔

متاثرہ گاؤں میں ہندو تنظیموں کے لیڈروں کے ساتھ حکومت کے وفود بھی دورہ کر رہے ہیں اور اطلاعات کے مطابق ہندو لیڈران دلتوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے ہیں جس سے فرقہ وارانہ تشدد پھوٹ پڑنے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

وزیر اعلی جے للتا

دراصل یہ معاملہ اچانک ظہور پذیر نہیں ہوگیا بلکہ اس کی آگ کافی دنوں سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اور جب بڑی ذات کے ہندوؤں نے چھوٹی ذات والوں کو اپنے تشدد کا نشانہ بنایا تو یہ آگ ایک دم بھڑک اٹھی۔ 4 جولائی اور 28 اور 31 اگست کو دونوں طبقوں میں زبردست جھڑپیں ہوئیں اور اونچی ذات کے ہندوؤں نے دلتوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا کر انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جہاں قبول اسلام کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اس موقع پر پولیس بھی کھل کر سامنے آگئی اور اس نے متعصبانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اونچی ذات والوں کا ساتھ دیا۔ دلتوں پر تشدد ڈھایا۔ ایک خاتون کا الزام ہے کہ 31 اگست کو پولیس نے ان لوگوں کو بری طرح پیٹا۔ یہاں تک کہ ایک حاملہ عورت کو بھی اس نے نہیں بخشا اور ایک زچہ کو بھی جس کے یہاں تین دن پہلے ہی ایک بچے کی پیدائش ہوئی تھی بری طرح زدوکوب کیا۔ ایک خاتون نے اپنے جسم پر آئے نیل کو دکھاتے ہوئے پولیس کو مورد الزام ٹھہرایا جس نے ایک لوہے کی سریا سے اس پر ضرب لگائی تھی۔ یہ سب کوڈین کولم گاؤں میں ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ پولیس اور اونچی ذات والوں نے انہیں اس لئے بھی نشانہ بنایا کہ اس گاؤں کے زیادہ تر لوگ خلیج میں ملازمت کرتے ہیں اور اقتصادی لحاظ سے یہ اونچی ذات والوں اور دوسرے گاؤں والوں سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔ پولیس اپنا

بقیہ: صفحہ ۹ پر

گنیش نے شراب پینے میں دودھ سے زیادہ تیزی دکھائی

"تم نے دیوتاؤں کی توہین کی ہے ہم تمہیں تسلیمہ نسرین بنادیں گے"

گذشتہ دنوں جب برادران وطن کا ایک بہت بڑا طبقہ اپنی مورتیوں کو دودھ پلانے کی دیوانگی میں مبتلا تھا اور دھارمک توہمات نے انہیں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا تو پٹنہ کی ایک خاتون وکیل نے "دودھ کے کرشمے" کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے "یوم توہمات" کے دوسرے دن گنیش جی کی مورتی کو دودھ کے بجائے شراب پلائی اور یہ دیکھ کر وہ

پٹنہ کی وکیل کماری جیوتی کو وشو ہندو پریشد کی دھمکی

دنگ رہ گئی کہ گنیش جی نے شراب پینے میں دودھ سے زیادہ تیزی دکھائی۔ اس واقعہ کے کئی دنوں کے بعد اب وشو ہندو پریشد اس خاتون وکیل کے پیچھے پڑگئی ہے۔ پریشد کا کہنا ہے کہ اسے دیوتاؤں کی اہانت کے جرم میں انہی حالات سے گزرنا پڑے گا جن سے بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین دوچار ہے۔

دراصل پٹنہ ہائی کورٹ کی وکیل کماری جیوتی لوگوں کی دیوانگی پر حیرت زدہ تھی وہ توہم پرستی کی نقاب کشائی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس کوئی موثر ہتھیار نہیں تھا۔ دریں اثنا سائنسدانوں نے "دودھ کے کرشمے" کا پردہ فاش کردیا۔ دوسرے دن کماری جیوتی اور اس کی ساتھی وکیل رما ستھا نے بار کونسل کے اپنے چیمبر میں لاتعداد وکلاء کے سامنے گنیش جی کی مورتی کو شراب پلائی۔ لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ شراب تو دودھ سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔ اس نے مقامی اخبارات کے مدیروں کو فون کرکے اس کی اطلاع دی اور کہا کہ دراصل مورتیوں کے دودھ پینے کا کوئی کرشمہ سرے سے ہے ہی نہیں یہ محض توہمات ہیں۔

اس کے بعد وشو ہندو پریشد کے جوائنٹ سکریٹری دیویندر ٹھاکر نے کماری جیوتی کو یہ دھمکی دی کہ وہ یا تو معافی مانگے یا 80 کروڑ ہندوؤں کے غیض و غضب کے لئے تیار ہوجائے۔ ان کا کہنا ہے کہ دیوتاؤں کی اہانت کے جرم میں اسے تسلیمہ نسرین کے حالات سے گزرنا ہوگا۔ جیوتی کا کہنا ہے کہ اس کے اس قدم کا مقصد دیوتاؤں یا ہندو مذہب کی توہین کرنا نہیں تھا اس کا مقصد فرضی کرشمے کو بے نقاب کرنا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے یہ کام "سیکولر انٹرنیشنل" نامی تنظیم کی موجودگی میں کیا ہے۔ کیونکہ وشو ہندو پریشد پوری دنیا میں ہندوؤں کو بیوقوف بنا رہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ وی ایچ پی یا جماعت اسلامی سے خوفزدہ نہیں ہے۔ اس کو کئی لوگوں نے دھمکی دی ہے لیکن بہتوں نے اس کی تعریف بھی کی ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہندو دیویاں درگا اور کالی کو بھی تو ان کے عقیدتمند شراب پلاتے ہیں اور شیو کو بھنگ پلائی جاتی ہے تو پھر میرے شراب پلانے پر اتنا واویلا کیوں؟ ادھر بی جے پی کے ترجمان سرجو رائے اور نائب صدر یوتھ مورچہ شنکر پرشاد نے بھی کماری جیوتی کی یہ کہہ کر مذمت کی ہے کہ اس نے دیوتاؤں کی اہانت کی ہے۔ یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔ سردست یہ تنازعہ زندہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی وشو ہندو پریشد والے کماری جیوتی کو ہندو تسلیمہ نسرین بنادیں گے۔

گجرات ۔ دہلی ۔ اتر پردیش ۔ مدھیہ پردیش اور راجستھان یونٹوں میں خانہ جنگی

بی جے پی کے خیمہ میں عام انتخابات سے قبل ہی جوتوں میں دال بٹنے لگی

رپورٹ: سہیل انجم

انتہائی جوش و خروش اور غرور و تکبر کے ساتھ دلی کی طرف رواں دواں بی جے پی کا کارواں طوفان کی زد میں آگیا ہے۔ مرکزی قائدین اس قافلے کو طوفان سے نکالنے کی جتنی جدوجہد کر رہے ہیں، طوفان اتنا ہی شدید ہوتا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں بی جے پی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو رہی ہے۔ وہ عروج سے زوال کی طرف گامزن ہو گئی ہے۔ بی جے پی کے مرکزی رہنماؤں اور مقامی سطح کے ورکروں کا دلی پر حکومت کرنے اور ہندوستان کو ہندو راشٹر میں تبدیل کرنے کا خواب چکنا چور ہو رہا ہے۔ آڈوانی اینڈ کمپنی کے ہوش اڑ گئے ہیں۔ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے اور پوری پارٹی تباہی و بربادی کے دلدل میں گرتی جا رہی ہے۔

بی جے پی کے لیڈران کا شروع سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ ان کی پارٹی ہندوستان کی واحد منظم اور نظم و ضبط کی پابند پارٹی ہے۔ قائد کی اطاعت اور اصولوں کی پاسداری اس کی بنیاد ہیں اور یہی ایک پارٹی ایسی ہے جس میں آپسی انتشار اور گروپ بندی نہیں ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت کی باتیں تھیں جب بی جے پی اقتدار سے دور تھی، حکومت کا نشہ اس پر طاری نہیں ہوا تھا اور دولت و ثروت کی چمک دمک سے وہ لاعلم تھی اور جب اس پارٹی میں محض مٹھی بھر لوگ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب جبکہ اس پارٹی کا حجم بہت بڑا ہو گیا ہے اور یہ پارٹی حکومت و اقتدار کی ذائقہ شناس ہو گئی ہے، کئی ریاستوں میں اس کی حکومتیں بن چکی ہیں اور یوپی میں بادشاہت کرنے کے بعد بادشاہ گر بن گئی ہے تو اس کے چہرے سے نقاب سرک گئی ہے۔ نظم و ضبط کی پابندی کا دعویٰ کھوکھلا ثابت ہو گیا ہے، اطاعت قائد اور اصولوں کی پاسداری کی قلعی کھل گئی ہے اور اس کا اصل چہرہ عوام کے سامنے آگیا ہے۔ گجرات میں کیا ہو رہا ہے، یوپی میں کیسی جنگ چل رہی ہے، مدھیہ پردیش میں کس طرح لوگ لڑ رہے ہیں۔ دلی میں کیسا خونی ٹکراؤ ہو رہا ہے اور خود مرکزی سطح پر کس طرح دو گروپ وجود میں آگئے ہیں، یہ اب ڈھکی چھپی باتیں نہیں رہ گئی ہیں۔ اقتدار کے لالچ اور ہوس میں بی جے پی کے لیڈران اندھے ہو گئے ہیں۔ گروپ بازی اور بالادستی کی جنگ نے بی جے پی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اگر اسے اس طرح کہا جائے کہ بابری مسجد کی شہادت رنگ لا رہی ہے اور اس کا قہر اس کا پیچھا کر رہا ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ 6 دسمبر بی جے پی کی مقبولیت کے نقطہ عروج کا آخری اور اس کی زوال پذیری کا پہلا دن تھا، اس کے بعد سے بی جے پی مسلسل تباہی و بربادی کی طرف گامزن ہے۔ سر پھٹول ہو رہا ہے، جوتم پیزار جاری ہے اور جوتیوں میں دال بٹنے لگی ہے، اور کہیں کہیں تو خونی تصادم کی بھی نوبت آگئی ہے۔

گجرات کا معاملہ سب سے گرم ہے۔ وہاں حکومت بنے ابھی محض چھ مہینے ہوئے کہ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ آڈوانی کے قریبی رہے شنکر سنگھ واگھیلا نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ وزیر اعلیٰ کیشو بھائی پٹیل کو غیر ملکی دورہ مختصر کر کے واپس آجانا پڑا۔ چرداگاؤں میں جہاں واگھیلا اپنے حامیوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، دونوں گروپوں میں خونی تصادم ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کیشو بھائی پٹیل کو اسمبلی میں اکثریت ثابت کرنے کے مرحلے سے دوچار ہونا پڑا۔ گجرات کے واقعات نے بی جے پی کے جوش و خروش پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا اور پارلیمنٹ کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے قدم رک گئے۔ دراصل گجرات کی بغاوت محض کیشو بھائی پٹیل کے خلاف بغاوت نہیں ہے۔ وہ ایک علامت ہے۔ بغاوت تو ان تمام ریاستوں میں ہو رہی ہے جہاں وہ برسر اقتدار ہے یا جہاں اس کی پوزیشن اچھی ہے۔ ملک گیر سطح پر بی جے پی میں گروپ بازی کا اگر تجزیہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ بی جے پی کے لئے ایک بھیانک صورت حال پیدا ہونے جا رہی ہے۔ عموماً اکثر ریاستوں میں دیکھا جا رہا ہے کہ بی جے پی اور سنگھ پریوار سے آئے ورکروں میں گروپ بازی ہو رہی ہے۔ آر ایس ایس کیڈر سے آنے والے پارٹی پر اپنی گرفت قائم کرنا چاہتے ہیں اور غیر آر ایس ایس عناصر اپنی بالادستی چاہتے ہیں۔ نتیجے میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو رہی ہے جو آگے چل کر بی جے پی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو سکتی ہے۔

> بی جے پی کے مرکزی رہنماؤں اور مقامی سطح کے ورکروں کا دلی پر حکومت کرنے اور ہندوستان کو ہندو راشٹر میں تبدیل کرنے کا خواب چکنا چور ہو رہا ہے۔ آڈوانی اینڈ کمپنی کے ہوش اڑ گئے ہیں۔ ان کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے اور پوری پارٹی تباہی و بربادی کے دلدل میں گرتی جا رہی ہے۔

دلی میں بھی زبردست رسہ کشی ہے جو یہاں گذشتہ دنوں ریاستی صدر اور ضلعی صدور کے انتخاب کے موقع پر دیکھنے کو ملی۔ وزیر اعلیٰ مدن لال کھورانہ، وجے کمار ملہوترہ ایم پی اور کیدار ناتھ ساہنی کا ایک گروپ ہے تو آر ایس ایس دھڑے کے اوپی کوہلی، وزیر ترقیات صاحب سنگھ ورما اور مشرقی دلی کے ممبر پارلیمنٹ (جو کہ وشو ہندو پریشد سے تعلق رکھتے ہیں) بی ایل شرما پریم کا دوسرا گروپ ہے۔ دونوں گروپ ریاستی شاخ پر بالادستی کے لئے خاموش جنگ لڑ رہے ہیں۔ ضلعی انتخابات میں پہلی بار دیکھا گیا کہ 16 میں سے 14 سیٹوں پر مقابلہ ہوا جبکہ اس سے پہلے اتفاق رائے سے لوگوں کو چن لیا جاتا تھا۔ دلی بی جے پی صدر کے لئے بھی اتفاق رائے پیدا کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن پارٹی کے باضابطہ امیدوار کیدار ناتھ ساہنی کے مقابلے میں کملا نگر کے ممبر اسمبلی پی۔ کے۔ چاندلہ نے ان کے خلاف کھڑے ہو کر بغاوت کو عملی روپ دے دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ کھورانہ، ملہوترہ اور ساہنی کا گروپ بی جے پی پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتا ہے لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ابھی گذشتہ دنوں کھورانہ اور بی ایل شرما پریم کا تنازعہ بری طرح اچھلا تھا جس پر شرما نے پارلیمنٹ کی رکنیت سے مستعفی ہو جانے تک کی دھمکی دے دی تھی۔

> گجرات میں کیا ہو رہا ہے، یوپی میں کیسی جنگ چل رہی ہے، مدھ پردیش میں کس طرح لوگ لڑ رہے ہیں۔ دلی میں کیسا ٹکراؤ ہو رہا ہے اور خود مرکزی سطح پر کس طرح دو گروپ وجود میں آگئے ہیں، یہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہیں۔

بی جے پی کے لیڈران اپنی پارٹی کی تباہی و بربادی پر فکر مند

اتر پردیش میں بھی حالات اس سے بہتر نہیں ہیں وہاں بھی آر ایس ایس اور غیر آر ایس ایس عناصر میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ کلراج مشرا کے ریاستی شاخ کے صدر کی حیثیت سے تیسری بار انتخاب نے اس گروپ بازی کی قلعی کھول دی۔ ویسے مایاوتی کے معاملے میں بھی دونوں گروپ آپس میں ٹکرائے تھے مگر مرکزی قیادت نے اسے سنبھال لیا تھا۔ کلراج مشرا دو بار صدر رہ چکے ہیں۔ جبکہ بی جے پی میں دو ہی بار کوئی صدر بن سکتا ہے۔ تیسری بار ان کا انتخاب ایک تکنیکی وجہ سے ہوا ہے۔ پہلی بار وہ اپنے پیش رو کے استعفیٰ کی وجہ سے صدر بنے تھے باضابطہ نہیں۔ لیکن اس بار ان کے حق میں کوئی نہیں تھا۔ آر ایس ایس کے سرسنگھ چالک رجو بھیا بھی نہیں تھے۔ وہ آر ایس ایس کے راج ناتھ سنگھ کو صدر بنوانا چاہتے تھے لیکن آر ایس ایس لابی حاوی نہ ہو جائے اس لئے کلیان سنگھ اور پارٹی کے ترجمان لال جی ٹنڈن نے ان کی مخالفت کی۔ باجپئی اور رجو بھیا لکھنؤ گئے اور کوئی متفق علیہ امیدوار نہ ہونے کی صورت میں کلراج مشرا کو پھر صدر بنا دیا گیا۔ حالانکہ کلیان سنگھ ان کے حق میں بھی نہیں تھے لیکن وہ اس لئے مطمئن ہیں کہ آر ایس ایس کی بالادستی کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔

مدھیہ پردیش میں سابق وزیر اعلیٰ سندر لال پٹوا اور ریاستی صدر ڈاکٹر لکشمی نرائن پانڈے میں چپقلش ہے۔ گذشتہ دنوں دونوں میں معاملہ اتنا گرم ہو گیا تھا کہ پٹوا نے پانڈے کے خلاف "ہتک آمیز" بیان دے دیا جس پر انہیں معافی مانگنی پڑی۔ یہاں پر ایسا لگتا ہے کہ جیسے آر ایس ایس طبقہ حاوی ہو رہا ہے۔ پانڈے آر ایس ایس مخالف ہیں اور اس وقت وہ صدر ہیں لیکن 29 اکتوبر کو پارٹی کے مرکزی صدر کے انتخاب کے بعد جس میں آڈوانی کو پھر چن لئے جانے کے امکانات ہیں، انہیں ہٹایا جا سکتا ہے۔ گویا یہاں آر ایس ایس نواز حاوی ہو رہے ہیں۔

راجستھان میں بھی بھیروں سنگھ شیخاوت اور

بقیہ صفحہ ۱۵ پر

اپنوں کے ہاتھوں سرزمین افغانستان لہولہان

اس وقت افغانستان اپنی تاریخ کے دوررس نتائج کے حامل سنگین اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہا ہے۔ طالبان کی حالیہ کامیابیوں نے ساری صورت حال کو نہ صرف یکسر بدل دیا ہے بلکہ دھماکہ خیز بھی بنا دیا ہے۔ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی، خصوصاً ایران و پاکستان میں سرگرمیاں تیز ہو گئی ہیں۔ ایران کے ایک سینئر وزیر نے حکمت یار سے مدتوں بعد ملاقات کی ہے۔ پاکستان نے اپنے سفارت خانے کی تباہی، عملے کی پٹائی اور ایک شخص کی ہلاکت کے بعد نہ صرف کابل میں اپنا سفارت خانہ بند کر دیا ہے بلکہ اسلام آباد میں واقع افغان سفارت خانے کے 13 اشخاص کو ملک سے نکال دیا ہے جس سے دونوں ملکوں کے تعلقات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ واضح رہے کہ برہان الدین ربانی کی حکومت پاکستان پر الزام لگاتی رہی ہے کہ وہ طالبان کی مدد کر رہی ہے۔ مگر حکومت پاکستان شدت سے اس سے انکار کرتے ہوئے افغانستان کی خانہ جنگی میں ناوابستگی کی پالیسی پر گامزن ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ پھر انہیں دنوں اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی عبداللہ مستری نے کابل کا دورہ کرنے کے بعد کہا کہ ان کا دورہ مفید رہا لیکن انہوں نے پریس کو تفصیلات بتانے سے انکار کر دیا۔ مبصرین کا خیال ہے کہ جناب مستری ربانی کو صدارت سے دستبردار ہونے اور اسے ایک غیر جانبدار کمیٹی کے حوالے کرنے کے لئے راضی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

لیکن کابل کے منظر نامے پر تادم تحریر سب سے زیادہ اہم چیز طالبان کا ربانی حکومت سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ پانچ دن کے اندر شہر ان کے حوالے کر دے یا پھر ان کے حملے کے لئے تیار ہو جائے۔ واضح رہے کہ طالبان کے ایک سینئر ترجمان نے یہ مطالبہ 20 ستمبر کو بھی کیا تھا۔ ممکن ہے یہ اخبار جس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہو اس وقت کابل اور اس کے گرد و نواح جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوں۔

> کابل حکومت کے مراعات یافتہ افسران بھی پریشان ہیں خاص طور سے وہ لوگ جو سابق کمیونسٹ حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ ایسے ہی ایک افسر نے غصے سے کہا کہ "طالبان کا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ وہ صرف مذہبی جنونی ہیں"، مگر خود طالبان کا کہنا ہے کہ وہ صرف قرآن اور احادیث رسولؐ کی اتباع کرتے ہیں

تقریباً ایک سال قبل افغانستان کے منظر پر طالبان کا ظہور ہوا۔ بہت جلد انہوں نے حکمت یار کی ملیشیا کو شکست دے کر تقریباً پورے مغربی افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جب انہوں نے کابل کے دروازے پر دستک دی اور ربانی حکومت سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا تو حکومتی افواج نے انہیں زبردست شکست دی۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ طالبان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے ہیں اور یہ کہ کابل اب امن کی سانس لے سکے گا۔ لیکن گذشتہ ایک ماہ کے دوران طالبان کے حق میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ انہوں نے نیم روز، فرح اور ہرات جیسے اہم شہر اور صوبے حکومتی افواج سے معمولی جنگوں کے بعد چھین لئے۔ اور اس وقت کابل سے چالیس کلومیٹر دور میدان شہر میں دارالحکومت پر حملے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ طالبان کی نئی کامیابیوں نے ایک بار پھر لوگوں کو ان کے وجود اور ان کے حامیان کے

بقیہ: صفحہ ۱۵ پر

بوسنیا ہرزے گووینا کا فیڈریشن۔ بوسنیا کا نصف علاقہ سربوں کے ہاتھ

بوسنیائی مسلمان امن منصوبے کی بڑی قیمت تو نہیں ادا کر رہے ہیں؟

بوسنیا کی تقسیم کے موضوع پر گزشتہ سال پانچ قومی رابطہ جاتی جماعت کی پیش کردہ تجویز کی روشنی میں سابق یوگوسلاویہ کے دو بڑے متحارب فریقوں کے درمیان بوسنیا ہرزیگووینا کی آئندہ حیثیت کے متعلق نائب امریکی وزیر خارجہ رچرڈ ہول بروک کی صدارت میں منعقد ایک میٹنگ کے دوران سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ اگرچہ بعض فروعی مسائل پر اختلافات ہنوز باقی ہیں۔

اس سمجھوتے کی رو سے بوسنیا ہرزے گووینا کو فیڈریشن کی شکل دے کر ان کی قانونی حیثیت برقرار رکھی جائے گی اور ان کی بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ جغرافیائی حدود بھی بدستور باقی رہیں گی۔ امریکہ کی سرپرستی میں عمل میں آنے والے امن اقدامات کے مطابق مسلم قیادت والی بوسنیائی حکومت اور اس کے بوسنیائی کروشیائی حلیفوں کے حصے میں 51 فیصد اور سربیوں کے حصے میں 49 فیصد آراضی آئی ہے جب کہ ابھی تک دو تہائی آراضی پر موخر الذکر کا قبضہ تھا۔ ایک طرح سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سمجھوتے کی بنیاد 51 اور 49 کے تناسب سے آراضی کی تقسیم کی تجویز ہی ہے۔

وفاق کے دونوں حصوں کو ہمسایہ ممالک سے خصوصی تعلق استوار کرنے کا اختیار ہوگا بشرطیکہ اس اقدام سے بوسنیا۔ ہرزے گووینا کی علاقائی سلامتی اور خود مختاری پر حرف نہ آئے۔ یہ دونوں حصے جن معاملات میں باہم دو طرفہ تعاون میں شریک ہوں گے وہ ہیں بین الاقوامی ادارے کی نگرانی میں انتخابات کروانا، حقوق انسانی کے معیارات کو اختیار کرنا اور ان کو نافذ کرنا، نقل و حرکت کی آزادی کو متاثر نہ ہونے دینا، بے گھر ہوجانے والے افراد کی نو آبادکاری اور معاوضہ دلانے میں مدد کرنا۔ ان کے معاملات سے متعلق تنازعات کے حل میں ثالثی کا کردار ادا کرنا۔

اس کے علاوہ فریقین نے بعض نکات پر اصولا اتفاق کیا ہے۔ مثلا بے گھر ہوجانے والے افراد کے لئے ایک کمیشن کا قیام جسے اختیار ہوگا کہ بین الاقوامی اداروں کی مدد سے متاثرہ افراد کو ان کی املاک واپس دلانے یا معقول معاوضہ دلانے میں فریقین کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے میں تعاون دیں، بوسنیا ہرزے گووینا انسانی حقوق کمیشن کا قیام جس کے فیصلے کا اطلاق فریقین پر حتمی طور پر ہوگا مشترک بوسنیا ہرزے گووینا پبلک کارپوریشنوں کا قیام جس کی کفالت دونوں جانب کی حکومتیں کریں گی۔ دونوں علاقوں کے شہریوں کے لئے ٹرانسپورٹ اور دیگر سہولتوں کے نظام کی تشکیل کرنا، قومی یادگاروں کے تحفظ کے لئے ایک خصوصی کمیشن کا قیام، جانبین کے مابین تنازعات سلجھانے کے لئے ایک نظام وضع کرنا۔

> امدادی رضاکاروں کے بیان کے مطابق اسی عشرے کے دوران دابوج قصبے کے 480 مسلمانوں کو پانچ منٹ کے نوٹس پر اپنے گھر چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔ اور ان کا سامان لوٹ لیا گیا

اس تبدیلی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سربیوں نے سراجیو اور اس کے نواح سے اپنے بھاری ہتھیار ہٹاکر امن مذاکرات کے لئے آمادگی کی رضامندی دے دی ہے لیکن انہیں راہ پر لگانے میں ڈنڈے نے اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ ڈنڈا ہے ناٹو کا۔ ورنہ عظیم سربیا کی تعمیر کے جنون میں انہوں نے اپنی سفاکیت سے پوری دنیا کو ہلادیا ہے۔ مذہبی اور نسلی تطہیر کے نام پر سربیائی وحشیوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی مثالیں جدید تاریخ میں کم ہی ملیں گی۔

ابھی حال میں شمال مشرقی بوسنیا میں 540 لاشوں سے پٹی ہوئی ایک اجتماعی قبر اس وقت دریافت ہوئی جب حکومتی فوجوں نے سربیائی باغیوں سے وہ علاقہ واپس لے لیا۔ یہ تو نہیں پتہ چل سکا کہ یہ لاشیں کن لوگوں کی تھیں لیکن غالب گمان یہی ہے کہ وہ سربیائیوں کے ہاتھوں مارے جانے والے بوسنیائی مسلمانوں اور کروشیائیوں کی لاشیں رہی ہوں گی۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانے میں بوسنیائی سربیوں نے نسلی تطہیر کی مہم کی ایک کڑی کے طور پر سربیائی اکثریت کے ایک گاؤں سے پانچ سو مسلمانوں کے ایک قافلے کو شہر بدر کردیا۔

> ناٹو کے اقدام نے طاقت کے استعمال کے مخالفین کے ان اندیشوں کو غلط ثابت کردیا کہ سربیاؤں کا کبھی قلع قمع نہیں کیا جاسکتا پھر بھی یہ سوال ذہن میں کھٹکتا ہے کہ ناٹو اس اقدام سے دو سال تک کیوں رکا رہا؟ بروقت اسی کاروائی کے ذریعہ لاکھوں افراد کی زندگی، ہزاروں عورتوں کی آبرو اور کروڑوں کی املاک بچائی جاسکتی تھی۔

سربیائی مظالم کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے بوسنیائی مسلم حکومت کو یہ سوچنا پڑرہا ہے کہ کہیں وہ امن منصوبے کی بڑی قیمت تو نہیں ادا کر رہی ہے جس کے لئے سربیوں کے ہاتھ میں بوسنیا کا آدھا علاقہ سونپا جارہا ہے۔ مسلم حکومت کی یہ تشویش بیجا بھی نہیں ہے کیونکہ 8 ستمبر کو متحارب گروہوں کے امن مذاکرات پر آمادگی کے بعد ایسے واقعات ہوتے رہے ہیں کہ مسلمانوں سے پورے کے پورے گاؤں خالی کروالئے گئے۔ امدادی رضاکاروں کے بیان کے مطابق اسی عشرے کے دوران دابوج قصبے کے 480 مسلمانوں کو پانچ منٹ کے نوٹس پر اپنے گھر چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔ ان کا سامان لوٹ لیا گیا اور آدھی رات کو تاریک جنگل میں انہیں 22 کلومیٹر پیدل چلایا گیا۔ ان میں سے بعض ضعیف اور بیمار افراد نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ گوراڈزے اور سراجیوو کی آبادی پر عرصہ حیات کیسے تنگ کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ سربیائی موقف میں یہ نرمی ناٹو کی سخت گیری کے احساس کی پیداوار ہے۔ جب سربیائی دھڑے کو پوری طرح یقین ہوگیا کہ ناٹو کی بمباری ان کی کمر توڑ دے گی تبھی انہوں نے بوسنیائی اور کروشیائی فوجیوں کے سامنے اپنی شکست تسلیم کی اور مذاکرات کی میز تک آنے ہی میں عافیت سمجھی۔ دوسری طرف ناٹو کے اقدام نے طاقت کے استعمال کے مخالفین کے ان اندیشوں کو غلط ثابت کردیا کہ سربیاؤں کا کبھی قلع قمع نہیں کیا جاسکتا اور ان سے نبرد آزمائی جنگ کو مزید طول دے گی۔ پھر بھی یہ سوال ذہن میں کھٹکتا ہے کہ ناٹو اس اقدام سے دو سال تک کیوں رکا رہا؟ کیا بروقت اسی کارروائی کے ذریعہ لاکھوں افراد کی زندگی، ہزاروں عورتوں کی آبرو اور کروڑوں کی املاک بچائی نہیں جاسکتی تھی۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بعد اب ٹیسٹ ٹیوب بھینس

دنیا کے مختلف ممالک میں ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعے بچوں کی پیدائش پر تجربات اور اس میں کامیابی کے مراحل سے تو ہم سب کسی قدر واقف ہیں لیکن ان تجربات کا اطلاق جانوروں کی افزائش نسل اور ان کی نسل کو بہتر بنانے کی سمت میں اقدام ہمارے یہاں ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ خاص کر بھینسوں کے سلسلے میں اس طریقہ کار کا اطلاق خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ اس میدان میں مصروف عمل افراد کے لئے مذبح خانہ بڑی کشش رکھتا ہے جب کہ عام لوگ وہاں سے گذرتے ہوئے بھی ناک پر کپڑا رکھ لیتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ بایولوجیکل طریقے سے جانوروں کی افزائش نسل کی تحقیق میں مصروف لوگ عام لوگوں جیسے تو نہیں ہوتے ہوں گے لیکن اپنے پیشے سے وفاداری اور مقصد کی لگن انہیں ایسی متعفن جگہ پر گھنٹوں گھومتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ مذبوح بھینسوں کے انبار میں بچ بچ کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے یہ ماہرین صبح سے شام تک مذبح خانے میں گھومتے رہتے ہیں اور اس جانفشانی کا مقصد ہوتا ہے ذبح ہوئی بھینسوں کی بیضہ دانیاں جمع کرنا۔ جی ہاں ذبح کی ہوئی بھینسوں کی بیضہ دانیاں۔ ان سے یہ لوگ اس بھینس کی جنسیاتی اعتبار سے کہیں بہتر نسل تیار کرتے ہیں۔

دہلی میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف امیونولوجی سے وابستہ ڈاکٹر ستیش ٹوٹے اس میدان کار کے رموز سے پوری واقفیت رکھتے ہیں اور یہ کہنا بیجانہ ہوگا کہ انہوں نے مذبح کو بھی زندگی کا سرچشمہ بنادیا ہے جب کہ اس کا تصور ذہن میں موت کی ہی یاد تازہ کرتا ہے۔ ان کا زیادہ تر وقت کسی مقامی مذبح میں کٹی ہوئی بھینسوں کے جابجا بکھرے ہوئے اعضاء کو الٹ پلٹ کرنے میں گذرتا ہے۔ ان کی اس تلاش کا مقصد بھینسوں کی بیضہ دانیاں حاصل کرنا ہوتا ہے جس کا سائز مٹر کے دانے سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ عموما ایک دورے میں تقریبا ایک درجن بیضہ دانیاں ستیش ٹوٹے کے ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ اس کے بعد بیضہ دانیوں کو لیباریٹری میں ایسے عمل سے گزارا جاتا ہے جن سے ان میں افزائشی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر ان بیضہ دانیوں سے بیضے الگ کرلئے جاتے ہیں اور بھینسے کے تولیدی خلیوں کی مدد سے بیضوں کو زرخیز بناکر بھینس کی بچہ دانی میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ مذکورہ انسٹی ٹیوٹ میں مویشیوں کی جنسیات کے ماہر ڈاکٹر جیتیا پاؤشے کے مطابق ایک بھینس کے لئے کم از کم دو بیضے حاصل کئے جاتے ہیں اور ہر بیضے کے لئے چار سے آٹھ تولیدی خلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس طرح لیباریٹری میں تیار ہونے والا ہر بیضہ اپنی جگہ پر جیتا جاگتا بھینس کا نمونہ ہوتا ہے۔

اس تکنیک کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے جانوروں کے ایسے بہت سے جنسیاتی جراثیم کو تلف ہونے سے بچایا جاسکتا ہے جو مذبحوں میں ضائع ہوجاتے ہیں جہاں کثرت سے دودھ دینے والے جانور بھی دودھ دینے کی صلاحیت کھودینے پر انسانوں کی خوراک بننے کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں ایسے ہی جانوروں کی بیضہ دانیوں سے بایولوجیکل تکنیک کی مدد سے فربہ اور صحت مند نسل تیار کی جاسکتی ہے۔ ستیش ٹوٹے کے بیان کے مطابق زندہ جانوروں کے اندر زرخیز شدہ بیضوں کو جو فضا ملتی ہے عین ویسی ہی فضا ٹیسٹ ٹیوب کے اندر پیدا نہیں کی جاسکتی تاہم اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں مطلوبہ تمام کیمیائی مادے متناسب مقدار میں استعمال ہوں تاکہ بچہ دانی کے اندر بیضوں کا ارتقاء مناسب رفتار سے ہو۔

کلیان سنگھ اور کلراج مشرا نے مایاوتی کے مسئلے پر نظریں ٹیڑھی کیں

کیا اتر پردیش میں بھی گجرات کی تاریخ دوہرائی جائے گی

اتر پردیش ایک بار پھر سیاسی غیر یقینی کے دلدل میں پھنس گیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ یہ اخبار جس وقت آپ تک پہنچے ریاست کی سیاسی صورت حال تہہ و بالا ہو چکی ہو۔ بی جے پی اور بی ایس پی کے اختلافات جس مقام پر پہنچ گئے ہیں وہاں سے واپسی دونوں کے لئے ناممکن نظر آتی ہے۔ یوپی بی جے پی کے لیڈران بالخصوص سابق وزیراعلیٰ کلیان سنگھ اور ریاستی صدر کلراج مشرا نے بغاوت کی جو آواز بلند کی ہے اگر اسے بی جے پی کے مرکزی لیڈران نے نقار خانے میں طوطی کی آواز سمجھا تو انہیں یہاں بھی گجرات کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ بات بی جے پی کے لیڈروں کو بھی اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر یوپی میں گجرات کی تاریخ دوہرانا نہیں چاہیں گے۔ اس لئے ان کے نزدیک حمایت واپسی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

کانشی رام اور مایاوتی بھی یہی چاہتے ہیں لیکن 30 اکتوبر تک یہ اپنی حکومت ہر حال میں چلنے دینا چاہتے ہیں۔ اس دن بی ایس پی کی ذات پات پر مبنی آخری ریلی ہے۔ اس کے بعد بی جے پی اگر حمایت واپس نہیں بھی لیتی ہے تو خیال کیا جاتا ہے کہ مایاوتی گورنر سے اسمبلی تحلیل کرنے کی سفارش کر سکتی ہیں۔ دراصل مایاوتی اب کارگزار وزیراعلیٰ بننا چاہتی ہیں وہ بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہی ہیں کہ بی جے پی آج نہیں تو کل حمایت واپس لے لے گی۔ اس لئے وہ بی جے پی کے کسی اقدام سے قبل ہی اقدام کرنا چاہتی ہیں تاکہ حالات ان کے قابو میں رہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے وزیراعظم سے بھی ملاقات کی ہے لیکن ابھی یہ بات واضح نہیں ہو سکی ہے کہ کانگریس کی کیا پالیسی ہے اور وہ اس معاملے میں کیا فیصلہ لے سکتی ہے۔ کیا کانگریس مایاوتی کو کارگزار وزیراعلیٰ بنانا پسند کرے گی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

کلراج مشرا، مایاوتی اور مرلی منوہر جوشی

کلیان سنگھ وغیرہ یوپی میں صدر راج چاہتے ہیں اور کانگریس بھی یہی چاہے گی۔ حالانکہ اس سے بی جے پی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن وہ ایسی صورت میں مایاوتی کو بھی کوئی فائدہ پہنچانا نہیں چاہے گی۔ کلیان سنگھ اور مایاوتی دونوں گورنر سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ جس کی بنا پر حالات مزید غیر یقینی ہوتے جا رہے ہیں ساتھ ہی مایاوتی یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ ان کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

بہرحال یوپی میں کب کیا ہو جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دسہرہ کے موقع پر ہی کچھ ہو جانا چاہئے تھا لیکن واجپئی نے سردست بحران کو ٹال دیا ہے۔ لیکن اس بحران سے کب تک دامن بچاتے رہیں گے دونوں پارٹیوں کے لیڈران۔ آج نہیں تو کل انہیں ایک دوسرے سے دامن چھڑانا ہی ہوگا اور وہ وقت جلد ہی آنے والا ہے۔

ایک مسلم سائنسداں کی خدمات کا اعتراف

1995ء کا "شانتی سروپ بھٹناگر ایوارڈ" ڈاکٹر سید احتشام حسنین کو دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر حسنین دوسرے مسلم سائنٹسٹ ہیں جنہیں "حیاتی سائنس" کے شعبے میں ان کی امتیازی خدمات کے سلسلے میں ایوارڈ دیا گیا ہے۔ پہلے مسلم سائنٹسٹ عبید صدیقی۔ ٹی آئی ایف آر بامبے ہیں۔ یہ سائنس کا بہت ہی باوقار ایوارڈ ہے جو قومی سطح پر سی ایس آئی آر کی جانب سے مجموعی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جاتا ہے۔ ان کی تحقیق کا میدان "بیکلو ارس جین ریگولیشن" رہا ہے۔ ڈاکٹر حسنین کی پیدائش 13 اپریل 1954ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ وہ مشہور استاد اور ادیب پروفیسر سید محمد حسنین سابق صدر شعبہ اردو گدھ یونیورسٹی کے صاحبزادے ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے بہت محنتی اور ذہین طالب علم رہے ہیں۔ بی ایس سی آنرس مگدھ یونیورسٹی سے امتیازی درجہ میں اور ایم ایس سی، ایم فل اور پی ایچ ڈی جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے کیا۔

وہ اس وقت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایمونولوجی دہلی میں سائنٹسٹ ہیں۔ وہ ویزیٹنگ فیلو اور سائنٹسٹ کی حیثیت سے انگلینڈ، کناڈا، امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی کام کر چکے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ نباتات سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ انہیں پہلے بھی کئی ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ وہ ہندوستان اور غیر ممالک کی کئی یونیورسٹیوں اور سائنس اکاڈمیوں کی کمیٹیوں میں بھی شامل کئے گئے ہیں جن میں نیشنل سائنس اکاڈمی دہلی اکیڈمک کونسل جواہر لال نہرو یونیورسٹی، آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز اور نیویارک اکاڈمی آف سائنس قابل ذکر ہیں۔ وہ ہندوستان اور بیرونی ممالک بالخصوص امریکہ، جنوبی کوریا، برازیل، چین، سوئزرلینڈ وغیرہ میں ساٹھ سے زائد لکچر دے چکے ہیں۔ ان کی نگرانی میں دس افراد پی ایچ ڈی اور دو افراد ایم ڈی کر چکے ہیں ان کے پچاس سے زائد تحقیقی مضامین ملکی اور غیر ملکی معیاری جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی نگرانی میں کئی بڑے بڑے پروجیکٹ چل رہے ہیں۔ اس میں سے ایک مکمل ہو چکا ہے۔ یہ پروجیکٹ حکومت ہند اور امریکہ کے ہیں۔ اتنی کم عمری میں یہ کامیابی یقینا قابل ستائش ہے اور ڈاکٹر احتشام حسنین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر سید احتشام حسنین

مغرب کا دوہرا پیمانہ ملاحظہ ہو

فرانس اور چین کو ایٹمی تجربوں کی آزادی مگر عراق پر مسلسل پابندی

فرانس اور چین کو حق حاصل ہے کہ جب اور جہاں چاہیں ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ کرسکیں۔ ان اور دوسرے جوہری ہتھیاروں سے مسلح ممالک کے بارے میں انٹر نیشنل ایٹمک انرجی ایجنسی کی پالیسی اس پالیسی سے مختلف ہے جو اس نے عراق کے تئیں اختیار کر رکھی ہے۔ ویانا میں قائم اس ایجنسی نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ وہ عراق کے نیوکلیر پروگرام پر گہری نظر رکھے گی کیونکہ اس کے بقول عراق نے اپنے پروگرام کی ساری تفصیلات اسے فراہم نہیں کی ہیں۔ مغربی ایشیا ہی کا ایک دوسرا ملک اسرائیل بھی ایک جوہری ملک ہے اور خود اس بین الاقوامی ایجنسی کے اندازے کے مطابق اس کے پاس سیکڑوں جوہری ہتھیار موجود ہیں لیکن آج تک تل ابیب کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کی گئی۔

عراقی جوہری پروگرام کے بارے میں اس بین الاقوامی ایجنسی نے، جسے عراق کے اس پروگرام کو ختم کرنے کی ذمہ داری خلیجی جنگ کے بعد دی گئی تھی، کہا ہے کہ وہ اس پر گہری نظر رکھے گا اور اس ضمن میں عراق کے ذریعہ فراہم کی گئی تفصیلات کی دوسرے ذرائع سے تصدیق بھی کرائے گا۔ دراصل اس بات کا پس منظر یہ ہے کہ حال ہی میں عراقی صدر صدام حسین کے داماد حسین کامل نے فرار ہو کر اردن میں سیاسی پناہ حاصل کرلی ہے۔ ان سے امریکی عہدیداروں کے علاوہ بین الاقوامی جوہری ایجنسی کے عہدیدار مل کر عراق کے جوہری پروگرام کے بارے میں تفصیلات معلوم کرچکے ہیں۔ دراصل حسین کامل ہی عراق کی فوجی صنعت اور جوہری پروگرام کے ذمہ دار تھے۔ ظاہر ہے اس وجہ سے وہ آج مغرب کے لئے کافی کارآمد اور اہم شخصیت بن گئے ہیں۔

حسین کامل کے فرار کے بعد بغداد حکومت نے خود ہی بین الاقوامی جوہری ایجنسی کو اور اقوام متحدہ کی طرف سے عراقی ہتھیاروں کو تباہ کرنے کے لئے متعین کئے گئے رالف ایکیس کو بلا کر بہت ساری فائلیں حوالے کردیں اور کہا کہ انہیں حسین کامل نے بغداد حکومت کی مرضی کے برعکس چھپا کر رکھا تھا۔ یہ ساری دستاویز عربی میں ہیں اور رالف ایکیس کے معاونین ان کا مطالعہ کرکے یہ طے کرنے کی کوشش میں ہیں کہ ان میں سے تفصیلی مطالعہ کے لئے کن دستاویزوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا جائے۔

چند دنوں قبل حسین کامل نے اپنے فرار کے بعد پہلی بار ایک امریکی ٹیلی ویژن سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ عراق نے خلیجی بحران کے بعد ایک ہنگامی ایٹمی بم بنانے کی کوشش تیز کردی تھی۔ یہ بم پانچ سو کلو گرام سے تین سو کلو گرام تک کا ہوسکتا تھا تاکہ اسے عراقی میزائلوں کے ذریعہ دشمن کے ٹھکانوں پر گرایا جاسکتا۔ حسین کامل نے ممکن ہے یہ بیان اس لئے دیا ہو تاکہ صدام مخالف عربوں اور مغرب کی نظر میں ان کی اہمیت اور مقبولیت قائم رہے لیکن رالف ایکیس کے ساتھ مغربی ممالک نے اس بیان یا انکشاف کے بعد حیرت کا اظہار کیا ہے۔ پہلے ہی امریکہ اور برطانیہ عراق کے خلاف عائد پابندیوں میں مزید دو ماہ کی توسیع کراچکے ہیں اور اندازہ ہے کہ ان نام نہاد "انکشافات" کے بعد وہ مدت دراز تک عراق کے خلاف پابندیاں جاری رکھنے کی اپنی مذموم کوشش جاری رکھیں گے۔ دراصل مغرب کا مقصد عراق کے ہتھیاروں کی تباہی کے ساتھ صدام حسین سے چھٹکارا پانا بھی ہے۔ یہ مقصد وہ معاشی پابندیوں کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے صدام حسین کم اور عراقی عوام زیادہ پریشان ہیں۔ وہ مشروط طور پر ان سخت پابندیوں میں نرمی کرتے ہیں تاکہ عراق تیل بیچ کر اس سے حاصل رقم سے اقوام متحدہ کی نگرانی میں اپنے بھوکے عوام کے

لئے خوراک اور دوائیں وغیرہ خرید سکے لیکن صدام حکومت نے ہمیشہ اسے عراقی اقتدار اعلیٰ کے خلاف ایک قدم قرار دے کر ٹھکرا دیا۔ ظاہر ہے اقوام متحدہ اور صدام حسین کے درمیان جاری اس کشمکش کے نتیجہ میں عراقی عوام مصائب جھیل رہے ہیں۔ ہزاروں بچے، بوڑھے اور دوسرے لوگ ضروری اشیاء کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے لقمہ اجل بن گئے ہیں۔ لیکن مغرب کا عذر لنگ یہ ہے کہ صدام حسین اس کے ذمہ دار ہیں۔ مغرب پہلے بھی صدام پر عوام دشمن پالیسیاں اختیار کرنے کا الزام لگاتا رہا ہے لیکن اس وقت بغداد کے خلاف معاشی پابندیاں عائد نہیں کی گئیں کیونکہ صدام حسین تب مغرب نواز تھے۔ سچائی یہی ہے کہ جو مغرب کا ہمنوا ہے اس کے سارے قصور معاف اور جو کسی وجہ سے مغرب کی مخالفت پر اتر آئے وہ قابل گردن زدنی ہے۔ چاہے اس کے لئے اس ملک کے عوام ہی کو نشانہ کیوں نہ بنایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عراقی عوام کے مصائب کے لئے آج صدام سے کہیں زیادہ مغرب ذمہ دار ہے جو عراق میں اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے اقوام متحدہ کو استعمال کر رہا ہے۔

> سچائی یہی ہے کہ جو مغرب کا ہمنوا ہے اس کے سارے قصور معاف اور جو کسی وجہ سے مغرب کی مخالفت پر اتر آئے وہ قابل گردن زنی ہے۔ چاہے اس کے لئے اس ملک کے عوام ہی کو نشانہ کیوں نہ بنایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عراقی عوام کے مصائب کے لئے آج صدام سے کہیں زیادہ مغرب ذمہ دار ہے۔

اپنے ملک کی عورت سے شادی کرو اور سرکاری خزانے سے رقم لو

جی ہاں متحدہ عرب امارات نے ملکی خاتون سے شادی کرنے پر امدادی رقم دینے کا فیصلہ کیا ہے

تیل کی دولت سے مالا مال خلیجی ریاستوں کے بارے میں بالعموم ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو یا تو ان کی دولت کی افسانوی تفصیلات پر مشتمل ہوتی ہیں یا ان کی سیاسی و سماجی زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اپنے عوام کے تئیں خلیجی حکمراں بہت ہی فراخدلانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مغربی تبصرہ نگاروں کی نگاہ میں ایسا اس لئے ہے کہ یہ حکمراں اپنے عوام کی طرف سے خائف رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ انہیں ایسی سہولیات فراہم کرنے کی فکر میں رہتے ہیں جو دوسرے کسی بھی ملک میں، یہاں تک کہ جاپان اور خوشحال مغربی ممالک میں بھی مفت دستیاب نہیں ہیں۔

ایسی سہولیات میں سے جو خلیجی عوام کو حاصل ہیں ایک یہ ہے کہ وہاں کی حکومتیں اپنے عوام کو شادی کے لئے آسان شرطوں پر قرض فراہم کرتی ہیں۔ ہمارے ہندوستانی سماج میں عورت ایک سستی جنس ہے لیکن خلیجی ممالک میں خوبصورت لڑکیاں ہی نہیں ان کے والدین بھی کافی خوش قسمت ہوتے ہیں۔ شادی کے لئے لڑکے کو نہ صرف اپنی بیوی کو طرح طرح کی سہولتیں فراہم کرنی ہوتی ہیں بلکہ اس کے والدین کو اچھی خاصی رقم دینی پڑتی ہے۔ چنانچہ خلیجی ممالک میں شادی ایک بہت ہی مہنگا سودا ہے۔

لیکن سعودی عرب اور دوسرے ممالک شادیوں میں اسراف پر پابندی لگانے میں ناکام رہے ہیں۔ الٹا ان حکومتوں نے ایسے فنڈ قائم کئے ہیں جو لوگوں کو مقامی عرب لڑکیوں سے شادی کرنے کے لئے مدد فراہم کرتا ہے۔ حال ہی میں متحدہ عرب امارات نے "غریب" عربوں کی شادی کے سلسلے میں قائم کئے گئے امدادی فنڈ کے دائرہ کار میں وسعت دے دی ہے۔ اب یہ فنڈ ان مردوں کی بھی مدد کرے گا جنہوں نے پہلے ہی کسی غیر خلیجی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی شادی شدہ زندگی تلخ ہے یا طلاق ہوچکی ہے اور اب وہ دوسری شادی کے متمنی ہیں۔ ایسے افراد کو فنڈ اس شرط پر رقم فراہم کرے گا کہ وہ کسی مقامی یا متحدہ عرب امارات کی لڑکی سے شادی کریں۔ شادی فنڈ کے سربراہ جناب جمال کا کہنا ہے کہ اس اسکیم کے اعلان کے بعد رواں سال کے اختتام تک دو ہزار درخواستوں کے وصول ہونے کی توقع ہے۔

> نئے قوانین کے تحت 27 سال سے اوپر کے وہ افراد جنہوں نے کسی غیر ملکی سے شادی کی ہوئی ہے اب اس فنڈ سے رقم حاصل کرکے کسی ایسی مقامی لڑکی سے شادی کرسکتے ہیں جس کی عمر 26 سال سے زیادہ ہو اور جو ابھی تک غیر شادی شدہ یا مطلقہ اور بیوہ ہو یہ امداد حاصل کرسکتے ہیں

متحدہ عرب امارات نے بنیادی طور پر یہ فنڈ اس غرض سے قائم کیا تھا کہ وہ اپنے شہریوں کو مقامی لڑکیوں سے شادی پر آمادہ کرسکے۔ لیکن اب اس فنڈ کے اصولوں میں ذرا سی تبدیلی کرکے ان لوگوں کی امداد کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو پہلے ہی کسی دوسرے ملک کی لڑکی کے ساتھ منسوب ہیں اور دوسری شادی کے بھی خواہشمند ہیں یا اپنی غیر ملکی بیوی کو طلاق دے چکے ہیں اور دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے امدادی فنڈ سے ایسے افراد کی مدد نہیں کی جاتی تھی مگر اب نئے قوانین کے تحت 27 سال سے اوپر کے وہ افراد جنہوں نے کسی غیر ملکی سے شادی کی ہوئی ہے اب اس فنڈ سے رقم حاصل کرکے کسی ایسی مقامی لڑکی سے شادی کرسکتے ہیں جس کی عمر 26 سال سے زیادہ ہو اور جو ابھی تک غیر شادی شدہ یا مطلقہ اور بیوہ ہو۔

متحدہ عرب امارات کے شادی فنڈ کے سربراہ جناب جمال کا کہنا ہے کہ گذشتہ سال شادی کرنے والوں کی مجموعی تعداد کے 36 فیصد لوگوں نے غیر ملکی خواتین سے شادیاں کیں جو ان کے خیال میں پریشان کن ہے کیونکہ اس سے مقامی لڑکیوں کی شادی نہ ہوسکے گی اور آگے چل کر ایک سماجی مسئلہ کھڑا ہوسکتا ہے۔ غیر ملکی لڑکیوں سے شادی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو دبانے ہی کے لئے شادی فنڈ کے قوانین میں نرمی پیدا کی گئی ہے۔ لیکن بظاہر حکومت اسراف پسندانہ شادیوں پر پابندی لگانے جیسے کسی اقدام سے خائف نظر آتی ہے کیونکہ اسے اس سے اپنے عوام کی ناراضگی کا اندیشہ ہے۔

> سعودی عرب اور دوسرے ممالک شادیوں میں اسراف پر پابندی لگانے میں ناکام رہے ہیں۔ الٹا ان حکومتوں نے ایسے فنڈ قائم کئے ہیں جو لوگوں کو مقامی عرب لڑکیوں سے شادی کرنے کے لئے مدد فراہم کرتا ہے۔

آئندہ عام انتخابات میں مسلمان کیا کریں

ایک سنجیدہ اور صحت مند بحث کا آغاز —— اہل فکر و نظر کے لئے ملی ٹائمز کے صفحات حاضر

عام انتخابات قریب ہیں اور سیاسی پارٹیوں کا نشانہ مسلمان ہیں۔ مسلمان جو اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت یا دوسری بڑی اکثریت ہیں، ہمیشہ نشانے پر رہتے ہیں۔ سیاستدانوں کی نگاہ التفات ہمیشہ انہی پر اٹھتی ہے اور ہمیشہ انہی کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ اگر کانگریس یا کوئی اور جماعت اپنے سیاسی مفادات کے تحت مسلمانوں کے ساتھ نام نہاد ہمدردی کا مظاہرہ کرتی ہے یا مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے نام پر نام نہاد اقدامات کرتی ہے تو بی جے پی جیسی فسطائی جماعت کے لیڈران فوراً آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اقدامات محض دکھاوا یا ریاکاری پر مبنی ہیں اس میں خلوص کا دخل نہیں ہے۔ لیکن وہ زور و شور سے چیخنا شروع کردیتے ہیں۔ دراصل ان کی یہ چیخ و پکار بھی سیاسی مفادات کی حصولیابی کی خاطر ہی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بے چارہ مسلمان خواہ مخواہ پیسا جاتا ہے اور نام نہاد اقدامات کو ایشو بنا کر تمام سیاسی پارٹیاں اس سے سیاسی مفاد کشید کرتی ہیں۔

ایک بار پھر مسلمانوں سے اظہار محبت کیا جارہا ہے، ایک بار پھر مسلمان سیاستدانوں کے نشانے پر ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اس بار تمام بڑی سیاسی پارٹیاں خود کو مسلمانوں کا مسیحا ثابت کرنے میں مصروف کار ہیں۔ یہاں تک کہ بی جے پی بھی جس کی سیاست کی اساس ہی مسلم دشمنی ہے، مسلمانوں کی گل پوشی کرکے انہیں اپنا دوست بنانے کے لئے بے چین ہے۔ اعلانات ہو رہے ہیں، اقدامات کئے جارہے ہیں۔ جماعتی سطح پر اور انفرادی طور پر بھی مسلمانوں کی قربت حاصل کرنے کی جدوجہد تیز کردی گئی ہے۔ کانگریس اور بی جے پی نے اس مہم پر اپنے کارندوں کو لگا رکھا ہے اور ان کے ایلچی مسلمانوں کو شیشے میں اتارنے کے لئے کوشاں ہیں۔ دراصل کانگریس، جنتادل اور بی جے پی تینوں پارٹیاں آئندہ عام انتخابات کے بعد مرکز میں حکومت سازی کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ جب تک مسلمانوں کی دعائیں شامل حال نہ ہوں ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ مسلمان چاہ لیں تو اقتدار کی حصولیابی کوئی مشکل امر نہیں۔

اس پٹری پر کانگریس کی گاڑی سب سے تیز دوڑ رہی ہے۔ وزیر اعظم سے لے کر چھٹ بھیا لیڈران تک، مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے اشاروں پر کانفرنسیں کی جارہی ہیں اور کنونشن منعقد ہو رہے ہیں۔ نرسمہا راؤ اپنی تمام تر جبنک کو برداشت کرتے ہوئے کبھی ایک خاص مسلک کے لوگوں کو رام کرنے لگتے ہیں تو کبھی اس مسلک کے دوسرے لوگوں سے کانفرنس منعقد کرواکر اپنے حق میں قراردادیں پاس کرواتے ہیں۔ کبھی ائمہ کنونشن منعقد کرواکر دستار فضیلت بندھوائی جاتی ہے تو کبھی اسی ائمہ تنظیم کی تقسیم کرواکر دوسرا کنونشن کروایا جاتا ہے اور اس سے بھی سیاسی مفاد کشید کرنے کی کوشش میں اپنے قریبی ساتھیوں کو اس میں شرکت کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ کانگریس کے کچھ لوگوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ پتا لگائیں کہ مسلمان کن کن اقدامات سے بیوقوف بن سکتے ہیں اور ان کو پھانسنے کے لئے کون سا جال زیادہ مضبوط ثابت ہوسکتا ہے۔ اردو بھی مسلمانوں کا ایک جذباتی مسئلہ ہے اس لئے اس کے کندھے پر بھی بندوق رکھ دی گئی ہے۔ انسانی وسائل کی ترقی کی وزارت کی جانب سے اردو کونسل بنائی جاتی ہے اور اس میں مستند سودے بازوں کو رکھ کر ایک جال پھینک دیا جاتا ہے۔ سماجی زندگی میں اردو کا کیا رول ہے؟ اس پر بھی غور و خوض کرکے مسلمانوں کو یہ بتانے اور جتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہمیں اردو بہت عزیز ہے۔ وزیر اعظم اپنی وزارتی کونسل میں مسلم وزراء کی تعداد کو پانچ سے بڑھا کر آٹھ کردیتے ہیں اور مسلم مسائل پر بالخصوص نظر رکھنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ کانگریس کے وزراء خوشامدانہ بیانات دیتے ہیں اور یہ انکشاف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حمایت کے بغیر کانگریس نے نہ کبھی اقتدار پایا ہے اور نہ ہی پاسکتی ہے اور مسلمانوں کے نزدیک کانگریس سے بہتر کوئی جماعت نہیں ہے۔

> اتنے سارے بازی گر ہیں اور ایک بے چارہ مسلمان ہے۔ اتنے شکاریوں میں ایک شکار۔ وہ ان سرگرمیوں پر حیرت زدہ ہے، اپنی صفوں کے سودے بازوں کی کرتوتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہے۔

بی جے پی بھی مسلمانوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہی ہے اور کانگریس و جنتادل پر مسلمانوں کی منہ بھرائی کرنے کا الزام لگانے والے اس کے لیڈران مسلمانوں کو خوش کرنے کے اعلانات کرتے ہیں۔ دلی کے بی جے پی کے وزیر اعلیٰ مدن لال کھورانہ بھی اماموں کی امامت کرنے دوڑ پڑتے ہیں اور ائمہ و موذنین کی تنخواہوں میں معمولی اضافے کا اعلان کردیتے ہیں۔ مستند سودے باز ایسے اعلانات پر فوری رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ کھورانہ کے اعلان پر بھی ایسے لوگوں کی طرف سے خیر مقدمی بیانات جاری ہوتے ہیں۔ بی جے پی وقف بورڈ کا سہارا لے کر بھی مسلمانوں میں نقب زنی کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے علیگڑھ میں مسلم کنونشن کرنے تک کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بعض مسلمان بھی ان چالوں میں پھنس جاتے ہیں اور کانفرنس، کنونشن اور میٹنگوں میں بی جے پی لیڈران کو مدعو کرکے ان کی حاشیہ برداری کرنے لگتے ہیں۔ ادھر جنتا دل یا نیشنل فرنٹ کے لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ مسلمان تو انہیں چھوڑ کر کہیں جائے گا نہیں۔

وہ مسلمانوں کی مجبوری ہیں۔ مسلمان کہیں گیا تو اس کا خمیازہ بھی بھگتے گا لہذا ہمیں کوئی اعلان و اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملائم سنگھ یادو بھی اسی خوش فہمی میں ہیں اور ارجن سنگھ بھی۔ بی ایس پی بھی مسلمانوں کو اپنا سمجھ رہی ہے وزیر اعلیٰ مایاوتی نے گذشتہ دنوں غازی پور کے مختار انصاری کو اپنی پارٹی میں شامل کرکے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی ایک اور چال چلی ہے۔

ایک طرف سیاستدانوں کی جانب سے یہ ساری کوششیں ہو رہی ہیں اور دوسری طرف ملت کا سودا کرنے والے وہ مستند سودے باز، جو ایسے معاملات میں پیش پیش رہتے ہیں پھر سامنے آگئے ہیں، جن کی قلعی کھل گئی ہے وہ بھی بازار میں ہیں اور جن کا بھرم ابھی قائم ہے وہ بھی اپنی دوکان سجانے لگے ہیں۔ سیاسی پارٹیاں بھی جانتی ہیں کہ اس قوم میں ماہر سودے بازوں کی کمی نہیں ہے اور اسی لئے وہ ایسے لوگوں کے ذریعے بولی لگوانے کے جتن کر رہی ہیں۔ جن کو ابھی تک کسی پارٹی نے گھاس نہیں ڈالی ہے اور جن کی ثالثی (دلالی) مشکوک ہوتی جارہی ہے، وہ بھی تڑپ رہے ہیں۔

> یہ حالات ہیں اور انتخابات قریب ہیں۔ خاموشی چھائی ہے۔ دانشور چپ اور اہل فکر و نظر سناٹے میں ہیں۔ نہ کوئی رہبر ہے نہ راہنما۔ نہ ہی حالات سے نمٹنے کے لئے لائحہ عمل تیار ہو رہا ہے اور نہ ہی صورت حال کی سنگینی کا کسی کو احساس ہے۔ احساس بھی ہے تو عمل کا فقدان ہے۔ ایسے حالات میں آخر مسلمان کیا کرے کدھر جائے کس کو اپنائے؟

اتنے سارے بازی گر ہیں اور ایک بے چارہ مسلمان ہے۔ اتنے شکاریوں میں ایک شکار۔ وہ ان سرگرمیوں پر حیرت زدہ ہے، اپنی صفوں کے سودے بازوں کی کرتوتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کرے؟ وہ ایک طرف سیاسی سانپوں سے بار بار ڈسا جاتا رہا ہے اور دوسری طرف اپنے مسیحا نما قاتلوں کی ستم ظریفی کا شکار ہوتا رہا ہے۔ انتخابات کے موقع پر اس کا سودا ہوجاتا ہے اور اسے علم بھی نہیں ہوپاتا۔ انتخابی بازار میں بار بار بیچا گیا ہے مسلمان۔ آج پھر وہ مخمصے میں ہے۔ شش و پنج میں گرفتار ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے کہ آئندہ عام انتخابات میں وہ اپنا قیمتی ووٹ کسے دے۔ کیا ایک بار پھر بابری مسجد کے قاتلوں کو اقتدار پر متمکن کردے، یا ایک بار بی جے پی جیسی فسطائی جماعت کو آزما کر دیکھے یا پھر نیشنل فرنٹ کو اقتدار میں لانے کی کوشش کرے۔ حالانکہ فرنٹ میں آپسی انتشار بھی بہت ہے اور یہ نام نہاد "تیسری طاقت" اقتدار میں آتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اسے یہ خطرہ بھی ہے کہ کہیں اس کا ووٹ منتشر نہ ہوجائے اور اس کا فائدہ بی جے پی نہ اٹھالے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آج کے حالات میں کانگریس ہی بہتر ہے تو کچھ بی جے پی کے قریب جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ایک طبقہ اس خیال کا حامی ہے کہ "تیسری طاقت" ہی اقتدار میں آئے گی لہذا مسلمان اسی کو ووٹ دے۔

یہ حالات ہیں اور انتخابات قریب ہیں۔ خاموشی چھائی ہے۔ دانشور چپ اور اہل فکر و نظر

بقیہ: صفحہ ۸ پر

الیکشن، رمضان اور سیاستداں

گذشتہ دنوں جب الیکشن کمیشن نے آئندہ عام انتخابات کے تناظر میں سات قومی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ایک میٹنگ کی تو اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے ساری پارٹیاں مسلمان ہوگئی ہیں سب دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی ہیں اور سب کو ارکان اسلام کی بے حد فکر ہے۔ جب اس پر تبادلہ خیال ہونے لگا کہ عام انتخابات کب کروائے جائیں تو تقریباً سبھی پارٹیوں کے لیڈروں نے یہ کہہ کر گویا بالواسطہ طور پر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا کہ الیکشن کبھی بھی ہوں لیکن رمضان میں نہ ہوں۔ مسلمانوں کو بہت پریشانی ہوگی اور انتخابی عمل کی بنا پر رمضان کے روزے متاثر ہوں گے (یا پھر روزوں کی وجہ سے انتخابی عمل متاثر ہوجائے گا۔) لہذا روزے ختم ہوتے ہی 20 فروری کے بعد انتخابات کروائے جائیں۔

سیاسی لیڈروں کو رمضان کی یاد آجانے کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو وہ رمضان سے ہمدردی جتا کر مسلمانوں سے ہمدردی جتانا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ روزوں کی فکر جتنی ہمیں ہے، آپ کو بھی نہیں ہوگی۔ ہم روزہ رکھیں یا نہ رکھیں ہمیں آپ کے روزوں کا بڑا خیال ہے۔ سیاسی لیڈروں کو تو اب افطار سے بھی اچھی خاصی رغبت پیدا ہوگئی ہے۔ روزہ رکھیں یا نہ رکھیں افطار ضرور کریں گے اور پابندی سے کریں گے۔ خواہ وقت سے ایک آدھا گھنٹہ پہلے ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اب اگر رمضان میں الیکشن پڑتا اور وہ بھی جنرل الیکشن تو بلاشبہ افطار پارٹیاں متاثر ہوجاتیں۔ نہ تو خاطر خواہ طریقے سے پارٹیاں ہوپاتیں اور نہ ہی پارٹیوں کی آڑ میں سیاسی لین دین اور سودے بازیاں ہوپاتیں۔ یوں بھی سیاسی افطار پارٹیوں کی اب دن بدن اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ یہ کام بذات خود انتخابی مہم سے کم بھاری بھرکم نہیں ہے۔ لہذا سیاستدانوں کو رمضان کے پیش نظر جنرل الیکشن کی تاریخ آگے بڑھانے کی اپیل کرنی پڑی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بی جے پی اس مہم میں پیش پیش تھی۔ اور اس نے دوسری پارٹیوں سے زیادہ پرزور انداز میں رمضان بعد الیکشن کرانے کی وکالت کی۔ حالانکہ دلی پر قبضہ کرنے میں وہ بہت اتاولی ہو رہی ہے لیکن اس نے یہ اشارہ دے دیا کہ ہم اقتدار کے مزے بعد میں لوٹ لیں گے پہلے افطار تو کرلیں۔

> دلچسپ بات یہ ہے کہ بی جے پی اس مہم میں پیش پیش تھی۔ اور اس نے دوسری پارٹیوں سے زیادہ پر زور انداز میں رمضان بعد الیکشن کرانے کی وکالت کی۔ حالانکہ دلی پر قبضہ کرنے میں وہ بہت اتاولی ہو رہی ہے لیکن اس نے یہ اشارہ دے دیا کہ ہم اقتدار کے مزے بعد میں لوٹ لیں گے پہلے افطار تو کرلیں۔

زیر آب ہیڈ کوارٹر کے قرب و جوار میں

عالی شان محلات اور شاہی قلعوں کی بھرمار

ابلیس کے ہیڈ کوارٹر کا انکشاف ——— چوتھی قسط

ابلیس کے مرکزی ہیڈ کوارٹر کے انکشاف سے بعض ذہنوں میں اس سوال کا پیدا ہونا فطری امر تھا کہ آخر اتنی اہم خبر صدیوں سے انسانی نگاہوں سے اوجھل کیوں رہی۔ ہمارے پاس بے شمار ایسے حیرت بھرے خطوط آئے ہیں جن میں اس انٹرویو کے جلد از جلد شروع کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو ہمارے نمائندے نے ابلیس کے باغی رفیق سے دمشق میں لیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس سوال کا جواب چاہا ہے کہ آخر اتنی اہم سرگرمیوں کے بارے میں دنیا اب تک بے خبر کیوں رہی جبکہ ابلیس کے وجود کا اثبات اس کے مسلسل سرگرم عمل ہونے کا ذکر اور رہتی دنیا تک نوع انسانی کو گمراہ کرنے کے لئے اس ملعون کو کھلی چھوٹ دئے جانے کا ذکر صاف صاف قرآن مجید میں موجود ہے؟

اس ضمن میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے کا کام اٹھارویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب سے باضابطہ شروع ہوا ہے اور اس حقیقت کے باوجود کہ جدید سائنس نے کائنات مسخر کرنے کے سلسلے میں بعض اہم پیش رفت کی ہیں۔ آج بھی ہمارے سائنسی محققین کو اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے اور بہت سے سوالات ایسے ہیں جس کا جواب عقلی طور پر دینے کے بجائے آج ماورائے عقل سے دینا ہی ممکن ہے۔ البتہ سائنسی انکشافات کی ابتدائی صدیوں میں چونکہ ساری توجہ عقلی انداز سے مسائل کو حل کرنے میں رہی اس لئے مذہبی کتابوں خاص طور پر قرآن یا بائبل کے قصوں کو محض تمثیلی انداز سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔

عقل پر پوری طرح انحصار کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ بیسویں صدی کے معروف مسلم فلسفی اور شاعر اسلام علامہ اقبال نے جنت اور جہنم کو جغرافیائی حقیقت سے سمجھنے سے انکار کردیا۔ اقبال کی سمجھ میں یہ حقیقت نہ آسکی کہ سرسبز و شاداب باغ اور دودھ اور شہد کی نہروں سے عبارت، خوبصورت آنکھوں والی حوروں کا مسکن اور انسانی لذات کو اپنی انتہا پر تسکین پہنچانے والی کوئی جنت واقعتاً کوئی جغرافیائی حقیقت ہو سکتی ہے۔ اقبال جدید سائنس کے ابتدائی دور میں سانس لے رہے تھے۔ جہاں عقلیات پر سارا زور تھا لہٰذا وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جنت یا جہنم جغرافیائی حقیقتیں نہیں بلکہ انسان کی اندرونی کیفیت (State Of Mind) ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سائنس کے بے شمار انکشافات کے باوجود کسی کی توجہ ان قرآنی اشارات کی طرف توجہ نہ گئی جو کائنات کے پوشیدہ حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

البتہ گذشتہ دو دہائیوں سے خود مغرب میں قرآن کے ذریعہ کائنات کو سمجھنے کی کوششوں کا آغاز ہوا ہے اور سائنسدانوں کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ کائنات کے سلسلے میں قرآن جن رموز کی نقاب کشائی کرتا ہے وہ جدید سائنسی تحقیق سے مکمل ہم آہنگ ہیں۔ البتہ تحقیق کا یہ نیا انداز ابھی بہت زیادہ عام نہیں ہو پایا ہے۔ لیکن جیسے جیسے قرآن کے ذریعہ کائنات کو سمجھنے کی کوشش عام ہوتی جائے گی جنوں کی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات عام انسانی معلومات کا حصہ بنتی جائے گی۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک سائنس نے جنوں کے وجود کے بارے میں کوئی واضح نقطہ نظر قائم نہیں کیا ہے بلکہ بعض سائنسداں تو جنوں کے وجود سے ہی منکر ہیں جبکہ قرآن جنوں کے وجود کے بارے میں اتنا واضح رویہ رکھتا ہے جتنا خود انسانوں کے بارے میں۔ جوں جوں خالص عقلی انداز فکر کا غلبہ کم ہوتا جائے گا جنوں کی دنیا کے بارے میں جدید سائنس کی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔

جہاں تک مثلث نمائے برمودا میں یا سمندر کی تہوں کے نیچے چند اور دوسری جگہوں پر شیاطین کی پراسرار سرگرمیوں کا تعلق ہے تو یہ کوئی ایسا عمل نہیں جو انسانی دنیا کے لئے کوئی نئی بات ہو۔

صدیوں قبل قدیم تاریخ کی کتابوں میں بالکل اسی انداز میں سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ملی ٹائمز نے اس حوالے سے کسی

سمندر کی تہوں میں اتر جائیے اور یہ دیکھ کر حیران رہیئے کہ بلند و بالا عمارتیں: حسین اور دلکش نقاشی کے دروازے، برآمدے، راہداری، کشادہ ہال آپ کے استقبال کے لئے پہلے سے موجود ہیں ان میں بعض عمارتیں تو اتنی نئی معلوم ہوتی ہیں جن پر حال کی تعمیر کا گمان ہوتا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ شاید یہ قدیم انسانی عمارتیں ہوں جو پانی کی سطح کے اوپر آنے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ غرق ہو گئیں

سنسنی خیزی کا ارتکاب کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس قسم کی پراسرار شیطانی سرگرمیوں کا تذکرہ مصر کے قدیم تاریخی مصادر میں ملتا ہے۔ توتموس ثالث جو اٹھارویں فرعون کے نام سے جانا جاتا ہے کے عہد کے ایک دستاویز میں، جو ویٹکن کے عجائب گھر میں محفوظ ہے کچھ اس طرح ذکر ہے:

بائیسویں سال اور جاڑے کے تیسرے مہینے میں دن کے چھٹے گھنٹے میں ایک عجیب چیز دیکھی گئی۔ آگ کا ایک گولا آسمان سے آرہا تھا اس کا حجم ایک میٹر لمبا اور ایک میٹر چوڑا رہا ہوگا۔ دیکھنے والے دہشت زدہ ہوگئے جب حواس بحال ہوئے تو فرعون سے جاکر بتایا۔ پھر متواتر ان حرکتوں کا ظہور ہوتا رہا۔ فرعون پریشان ہو اٹھا۔ فرعون نے ملک میں امن کی بحالی کے لئے دعا کروائی اور اس واقعہ کو سرکاری گزٹ میں درج کرنے کا حکم دیا۔

کچھ اسی طرح کا تذکرہ سکندر اعظم کے عہد کی تاریخی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ یہ 329 قبل مسیح کا واقعہ ہے جب اس کی فوج نے فضا میں اترتے چمکدار گولوں کا مشاہدہ کیا۔ ارسطو جو خود اس قسم کی محیر العقل حرکتوں کا مشاہدہ کر چکا تھا کا تعلق آسمان سے بتاتا تھا۔ Pliny کی Natoral History جو 100 قبل مسیح میں لکھی گئی، میں درج ہے "ایک چمکدار دائرہ نما چیز فضا میں اڑتی ہوئی مشرق سے مغرب کی طرف جاتی دیکھی گئی۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں بھی اہل یورپ نے ان آگ کے گولوں کو آسمان میں اڑتے دیکھا لیکن تب مذہبی توہم کے زیر اثر پادریوں نے اسے آسمان سے آنے والی صلیب بتاتی۔"

گویا ابلیسی دنیا کا انسانی دنیا میں ظہور کوئی نیا عمل نہیں ہے۔ البتہ کل تک اس کی کوئی توجیہ ممکن نہ تھی آج ابلیس کے رفیق کے انٹرویو کی روشنی میں اس پراسرار سرگرمی کی نوعیت سے پردہ اٹھ چکا ہے۔

سائنسدانوں کے اس حلقے کا جو آج بھی خالص عقلی طریقہ استدلال کا قائل ہے کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس علاقے میں ہونے والے بے شمار حادثات کی وجہ کوئی مقناطیسی کشش ہو جو اس علاقے میں پائی جاتی ہو لیکن اس علاقے کی سرگرمیوں کے دوسرے مشاہدین اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ بحری جہاز یہاں جس انداز سے غائب ہوتے رہے ہیں اس

جدید ہوائی جہازوں میں ایسا کمپیوٹر نصب ہوتا ہے جو حادثے کے بعد بھی جہاز کے بارے میں معلومات دیتا رہتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس علاقے میں غائب ہونے والے جہازوں کا نظام کمپیوٹر ناکارہ بنا دیا جاتا ہے اور وہ اپنے جائے وقوع کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دے پاتا۔

سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ڈوبتے نہیں بلکہ اچک لئے جاتے ہیں ورنہ ہوائی جہازوں کے غائب ہوجانے کا آخر کیا سبب ہوسکتا ہے۔ جدید ہوائی جہازوں میں ایسا کمپیوٹر نصب ہوتا ہے جو حادثے کے بعد بھی جہاز کے بارے میں معلومات دیتا رہتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس علاقے میں غائب ہونے والے جہازوں کا نظام کمپیوٹر ناکارہ بنا دیا جاتا ہے اور وہ اپنے جائے وقوع کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دے پاتا۔ سائنسدانوں کا یہ گروہ اس امر پر حیران ہے کہ 1945ء میں جب فضا میں پانچ جنگی جہاز اس علاقے میں پرواز کر رہے تھے تو اچانک جہازوں کے اس جھنڈ کے درمیان آگ کا ایک گولا نمودار ہوا اور پھر ان جہازوں کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ جہاز آپس میں ٹکرا گئے ہوں کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے ملبے سمندر میں گرتے دیکھے جاتے۔ بلکہ یہ کہ گولے کے نمودار ہونے کے بعد یہ پانچ طاقتور جنگی جہاز اچانک نہ جانے کہاں لاپتہ ہوگئے۔

برمودا کے اردگرد اب تک جن علاقوں میں انسانی پہنچ ممکن ہوسکی ہے وہاں ایک اور حیرت ناک امر کا سراغ ملا ہے۔ سمندر کی تہوں میں عین مثلث نمائے برمودا میں تو اب تک کسی کی رسائی ممکن نہیں لیکن اردگرد کے علاقوں میں پانی کے اندر بے شمار ویران محلات دیکھے گئے ہیں ان میں بعض محلات اتنے شاندار ہیں کہ ان پر شاہی قلعوں کا گمان ہوتا ہے۔ سمندر کی تہوں میں اتر جائیے اور یہ دیکھ کر حیران رہیئے کہ بلند و بالا عمارتیں، حسین اور دلکش نقاشی کے دروازے، برآمدے، راہداری، کشادہ ہال آپ کے استقبال کے لئے پہلے سے موجود ہیں۔ ان میں بعض عمارتیں تو اتنی نئی معلوم ہوتی ہیں، جن پر حال کی تعمیر کا گمان ہوتا ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ شاید یہ قدیم انسانی عمارتیں ہوں جو پانی سطح کے اوپر آنے کے نتیجے میں رفتہ رفتہ غرق ہو گئیں لیکن سوال کا یہ سیدھا اور آسان جواب اس لئے تشفی بخش نہیں ہے کہ ان میں بعض عمارتیں تو بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور جہاں تک سطح آب کے اوپر آنے اور اس سلسلے میں گلیشیر کے پگھلنے کے سائنسی اندازے کا تعلق ہے تو وہ خود سائنسی اندازے کے مطابق تیرہ چودہ ہزار سال پہلے کا واقعہ ہے ظاہر ہے اتنی مدت تک کوئی محل صحیح سالم حالت میں کیسے پایا جاسکتا ہے؟ رہی یہ بات کہ یہ محل ویران کیوں ہیں؟ یا مشاہدین کو ویران حالت میں کیوں ملے تو اس سوال کا کوئی صحیح جواب اسی وقت مل سکتا ہے جب اس دنیا کے ایک اہم فرد اور ابلیس کے قریبی رفیق کی گفتگو ملاحظہ نہ کرلی جائے جو اس نے بغاوت کے بعد ہمارے نمائندے سے کی ہے اور جسے ہم عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔

البتہ ہم اپنے قارئین پر یہ بات واضح کردینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نمائندے نے اپنی گفتگو کو غیر ضروری تفصیلات پر مرکوز کرنے کے بجائے ان سوالات کے گرد رکھا ہے جو شیطان کے مرکزی ہیڈکوارٹر میں آج زیر بحث ہیں۔ پھر چونکہ اس باغی رفیق نے شیطان کے بعض خفیہ منصوبوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے اس لئے ہوسکتا ہے اس کی اشاعت ان حلقوں پر گراں گزرے جو جان بوجھ کر یا غیر شعوری طور پر شیطانی سازشوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ اور سب سے اہم اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اسلام کو غالب کرنے کی مختلف الجہات کوششوں پر خود شیطان کے مرکزی ہیڈکوارٹر میں کس انداز سے بحث ہوتی ہے۔ اور یہ کہ بعض اسلامی کام جسے ہم اسلام کے حوالے سے کرکے خوش رہتے ہیں وہ ابلیس کے نزدیک کتنا بے ضرر عمل ہے اور اس عمل میں لگائے رکھنے کے لئے خود اس کے ہیڈکوارٹر میں جو خصوصی کمیٹی کام کرتی ہے اس کا طریقہ کار کیا ہے؟۔ یہ اور اس قسم کے بے شمار چشم کشا حقائق سے اب پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔

سب سے اہم اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اسلام کو غالب کرنے کی مختلف الجہات کوششوں پر خود شیطان کے ہیڈکوارٹر میں کس انداز سے بحث ہوتی ہے۔ اور یہ کہ بعض اسلامی کام جسے ہم اسلام کے حوالے سے کرکے خوش رہتے ہیں وہ ابلیس کے نزدیک کتنا بے ضرر عمل ہے اور اس عمل میں لگائے رکھنے کے لئے خود اس کے ہیڈکوارٹر میں جو خصوصی کمیٹی کام کرتی ہے اس کا طریقہ کار کیا ہے؟۔ یہ اور اس قسم کے بے شمار چشم کشا حقائق سے اب پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

[illegible] انتخابات میں مسلمان کیا کریں

سناٹے میں ہیں۔ نہ کوئی راہبر ہے نہ راہنما۔ نہ ہی حالات سے نمٹنے کے لئے لائحہ عمل تیار ہو رہا ہے اور نہ ہی صورت حال کی سنگینی کا کسی کو احساس ہے۔ احساس بھی ہے تو عمل کا فقدان ہے۔ ایسے حالات میں آخر مسلمان کیا کرے کدھر جائے کس کو اپنائے؟ اس موقع پر صاحب بصیرت اور صائب الرائے حضرات پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سامنے آئیں اور مسلمانوں کو اس اندھی سرنگ سے نکالنے کے جتن کریں۔ انہیں روشنی دکھائیں۔ وہ غور و فکر کریں اور حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے لائحہ عمل تیار کریں تاکہ عمل کی راہیں وا ہوں اور مسلمان اس گو مگو کی کیفیت سے باہر نکل کر اجتماعی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں آسکے۔

(نوٹ:۔۔۔ قارئین، اہل نظر، اہل فکر اور دانشور حضرات کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مذکورہ مضمون کی روشنی میں غور و خوض کریں۔ انتخابات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟ اس پر اپنی رائے اور اپنے احساسات سے ہمیں آگاہ کریں۔ اس مسئلے پر ہم کھلی بحث کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ سنجیدہ احساسات و خیالات کو ہم نمایاں انداز میں شائع کریں گے۔ تاکہ امت کو کوئی فیصلہ لینے میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ایڈیٹر)

6

"آپ ایک مسلم انقلابی کو تو جیل بھیج سکتے ہیں لیکن انقلاب کو پابہ زنجیر نہیں کر سکتے"

ایک جھوٹے مصری کی گواہی پر شیخ عمر عبدالرحمن کو سزائے عمر قید

نوماہ کے مقدمے کے بعد بالآخر ایک امریکی عدالت نے ایک جھوٹے مصری کی مشکوک گواہی کی بنیاد پر ایک انقلابی اور مذہبی لیڈر شیخ عمر عبدالرحمن کو پانچ مختلف جرائم کا مرتکب قرار دے کر جیل بھیج دیا ہے۔ مدتوں بعد کسی امریکی عدالت نے ایک بہت ہی کم استعمال ہونے والے قانون "غدارانہ سازش" کو بھی شیخ کے خلاف عائد کیا ہے اور اس طرح انہیں عمر قید کی سزا دی ہے۔ جب کورٹ میں فیصلہ سنایا گیا تو شیخ عمر عبدالرحمن اور 9 دوسرے "مجرم" انقلابیوں نے اسے بغیر کسی پریشانی کے سنا۔ ایک انقلابی تو درمیان میں باقاعدہ اللہ اکبر کا نعرہ بھی لگاتا رہا۔ شیخ عمر عبدالرحمن خود سر جھکائے ایک ترجمان کی مدد سے فیصلہ سنتے رہے۔ اس پورے مقدمے کے دوران یہی ان کا معمول تھا یعنی سر جھکا کر کورٹ میں کھڑے رہتے۔

اس فیصلے کے بعد شیخ عمر کی وکیل مس لین اسٹیورٹ کا کہنا تھا کہ مقدمے سے پہلے ہی ایسا ماحول پیدا کردیا گیا تھا کہ شیخ دہشت گرد ہیں، ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر بمباری کے ذمہ دار اور 1993ء میں مختلف امریکی و اقوام متحدہ کے ٹھکانوں پر حملے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ایسے ماحول میں، مس اسٹیورٹ کے بقول، ججوں نے گواہیوں کو پرکھنے کے بجائے یہی بہتر تصور کیا کہ اس "دہشت گرد" کو بس جیل بھیج دو۔ مس اسٹیورٹ نے یہ بھی کہا کہ وہ اس فیصلے کے خلاف اپیل کریں گی۔

> جب کورٹ میں فیصلہ سنایا گیا تو شیخ عمر عبدالرحمن اور 9 دوسرے "مجرم" انقلابیوں نے اسے بغیر کسی پریشانی کے سنا۔ ایک انقلابی تو درمیان میں باقاعدہ اللہ اکبر کا نعرہ بھی لگاتا رہا۔ شیخ عمر عبدالرحمن خود سر جھکائے ایک ترجمان کی مدد سے فیصلہ سنتے رہے۔ اس پورے مقدمے کے دوران یہی ان کا معمول تھا

اس فیصلے کے بعد شیخ عمر نے کہا کہ "میں پہلا شخص نہیں ہوں جسے اس کے مذہبی عقائد کی وجہ سے جیل کی سزا ہوئی ہے۔" شیخ کے ایک معاون احمد ستار، جو ان کے لئے ترجمہ کی خدمت انجام دیتے ہیں، نے کہا کہ "آپ اس انقلابی کو جیل تو بھیج سکتے ہیں لیکن بذات خود انقلاب کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں بھیج سکتے۔"

57 سالہ شیخ عمر مصر کے ایک گاؤں الجمالیہ میں پیدا ہوئے۔ 11 سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا۔ اس کے بعد الازہر میں تعلیم حاصل کی اور اشاعت دین میں مصروف ہوگئے۔ ان کی دو بیویوں سے 13 اولادیں ہیں۔ شیخ عمر ایک شعلہ بیاں مقرر اور اسلامی شریعت کے نفاذ کے علمبردار۔ وہ مصر کے لاکھوں نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ آپ کی تقریروں نے مصری حکمراں طبقے کی نیندیں حرام کردی تھیں چنانچہ وہ ان کے پیچھے پڑگیا اور جان لینے کے درپے آگیا۔ شیخ نے 1990ء میں امریکہ میں سکونت اختیار کرلی۔

شیخ عمر کا مصری حکومت سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ 1970ء میں انہوں نے فتویٰ دیا کہ جمال عبدالناصر دہریہ تھا اس لئے اس کے لئے دعا کرنا یا اس کی نماز جنازہ پڑھنا کارگناہ ہوگا۔ ایک مصری عدالت نے حکومت کے اشارے پر شیخ کو اس فتوے کی پاداش میں 8 ماہ جیل کی سزا سنائی تھی۔ لیکن جب 1981ء میں الجہاد نامی ایک تنظیم نے انور سادات کو قتل کردیا تو مصری حکومت نے شیخ پر پھر توجہ کی۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ الجہاد کے سربراہ ہیں اور یہ کہ انہوں نے ایک فتوے کے ذریعہ سادات کے قتل کی ترغیب دی تھی۔ لیکن عدالت نے اس الزام سے انہیں بری کردیا تھا۔

افغانستان سے روس کے نکلنے کے بعد وہ سینکڑوں مصری جو وہاں برسرپیکار تھے، اپنے وطن لوٹ آئے اور شیخ کے فرمانبردار بن گئے۔ وہ مصر میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے مسلح جدوجہد کرنے لگے، حکومت نے ایک بار پھر شیخ پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کردیا۔ لیکن اس بار شیخ مصر چھوڑ کر امریکہ چلے آئے اور نیو جرسی کو مرکز بناکر امریکہ کے طول و عرض میں خطبات دینے لگے۔ بہت جلد امریکہ میں شیخ کا حلقہ اثر کافی وسیع ہوگیا۔

شیخ پر امریکہ کا الزام ہے کہ وہ اس کی مغربی ایشیا پالیسی میں تبدیلی کی خاطر "دہشت گردی" کو فروغ دے رہے تھے۔ شیخ کو پھنسانے کے لئے ایک دغا باز اور جھوٹے سابق مصری جاسوس کی ایک ملین ڈالر کے عوض خدمات حاصل کی گئیں جو شیخ کے حلقے میں داخل ہوگیا۔ اس نے شیخ کی تقریروں اور نجی گفتگوؤں کے ریکارڈ تیار کئے جو عدالت میں شیخ کے خلاف استعمال کئے گئے۔ لیکن یہ ریکارڈ مبہم اور غیر واضح ہیں اور صاف پتہ چلتا ہے کہ مقصد کسی نہ کسی طرح شیخ کو جیل بھیجنا تھا۔

شیخ کو جیل بھیجنے کے امریکی فیصلے کے بعد امریکہ، مصر اور عرب ممالک کے مسلمانوں میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی ہے اور امریکیوں کو اندیشہ ہے کہ ان کے چاہنے والے امریکی ٹھکانوں پر حملے کرسکتے ہیں۔ لیکن خود شیخ عمر نے ایسی کوئی تلقین نہیں کی ہے۔ البتہ انہوں نے امریکی قوانین پر سخت اعتراضات کئے ہیں۔ شیخ دراصل سوگر اور دل کے مریض ہیں۔ عدالت کے فیصلے کے بعد انہیں ایک قیدیوں کے لئے مخصوص اسپتال لے جایا گیا جہاں ان کے خفیہ اعضاء کا بھی زبردستی اور ان کے احتجاج کو نظرانداز کرکے جائزہ لیا گیا۔ اس حرکت کو امریکی قانون قرار دیا گیا تو شیخ نے کہا کہ ایسے امریکی قوانین انہیں مریض بنارہے ہیں۔ شیخ نے یہ الزام بھی لگایا کہ اس نئے طبی مرکز میں نیو جرسی جیل کے اسپتال سے زیادہ سہولتیں نہیں ہیں۔ دراصل حکومت اس بہانے شیخ کو نیو جرسی جیل سے ہٹاکر کہیں اور رکھنا چاہتی تھی۔

سماعت کا منظر ایک آرٹسٹ کی نظر میں: درمیان میں ٹوپی پہنے شیخ عمر عبدالرحمن

بقیہ: قبول اسلام سے ہندو تنظیموں میں بوکھلاہٹ

پولیس یہ بھی کہتی ہے کہ گاؤں والوں نے پولیس ایکشن کے ڈر سے فرقہ وارانہ تشدد برپا کردیا جبکہ گاؤں والے سختی سے اس کی تردید کرتے ہیں۔ گاؤں والوں نے گاؤں میں آنے والے راستے کو خاردار تاروں و کلنٹے دار جھاڑیوں سے بلاک کردیا تھا تاکہ کوئی دوسرا اس گاؤں پر حملہ نہ کرسکے۔ لیکن پولیس کے لئے یہ رکاوٹیں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں وہ گاؤں میں گھس آئی اور بلا وجہ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پولیس کہتی ہے کہ ہم نے ہوائی فائرنگ کی تھی جبکہ گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے۔ پولیس نے لوگوں پر گولی چلائی جس سے کئی لوگوں کو گولی لگنے سے شدید چوٹیں بھی آئیں۔

پولیس اس فرقہ وارانہ واقعہ کو مجرمانہ واقعہ میں بدلنا چاہ رہی ہے تاکہ اس کی کرتوتوں پر پردہ پڑ جائے۔ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس بھی مجرمانہ سرگرمیوں کی بات کرتے ہیں جبکہ گاؤں والے اس کی تردید کرتے ہیں۔ النتھا، سنگا تھنکروچی، کاسی لنگا پورم، میلہ پودانی، پولم پتی اور اکنی چن پٹی گاؤوں میں بھی پولیس نے دلتوں پر مظالم توڑے اور اب یہاں کے لوگ بھی محفوظ جائے پناہ کی تلاش میں ہیں۔

اس وقت ان دلت علاقوں میں حالات بری طرح کشیدہ ہیں۔ ہندو منانی، وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کے لیڈر دورے پر دورے کر رہے ہیں اور دلتوں کو تحفظ کی یقین دہانیاں کرواکر انہیں قبول اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن دلتوں کا کہنا ہے کہ ہم نے مشرف بہ اسلام ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے اور ہمیں اب اسلام میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

سرسید احمد خاں کی وراثت کیا ہے ؟ کیا صرف تہذیب الاخلاق اور سائنٹفک گزٹ کے چند پرچے ؟ کیا صرف ایم اے او کالج جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے ؟ کیا صرف آثار الصنادید اور دربار اکبری کا ان کا مرتبہ ایڈیشن ؟ کیا صرف اسباب بغاوت ہند ؟

ہرچند کہ ان میں سے ہر ایک کا نہیں بعض کا مرتبہ ایسا ہے کہ اپنے خالق کو زندہ جاوید بنا دے لیکن سرسید کی عہد آفریں شخصیت ان میں سے ہر ایک کارنامے سے بڑی ہے ۔ اور بڑی شخصیت کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دور میں طلوع تو ضرور ہوتی ہے مگر اپنے دور کے ساتھ غروب نہیں ہوتی اور اس کی روشنی سے ایک نہیں کئی جہات پیدا ہوتی ہیں۔

سرسید ایک دل شکستہ دور میں پیدا ہوئے اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل اس طرح جاری و ساری تھا کہ اس سے محفوظ رہنا مشکل تھا۔ اس وقت سرسید نے ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور سمٹتے ہوئے دور کو خون کے آنسوؤں سے الوداع کہا اور دل کڑا کر کے نئے زمانے کے تقاضوں کے سانچے میں خود کو ڈھالا۔ اس طرح کہ جو کچھ تہذیبی اثاثہ اس قیامت صغریٰ میں بچ سکتا تھا بچا لائے اور نئی نسل کو محض مایوسی کی نذر ہونے سے محفوظ کرلیا

اس سے کچھ کم قیامت ہماری آپ کی نسل پر 1947 ء میں نہیں ٹوٹی ہے اتنی اور ایسی کہ آج 1995 ء میں یہ سطریں لکھی جارہی ہیں تب بھی تقسیم کا زخم اسی طرح رس رہا ہے جیسے کل کی بات ہو بقول سراج اورنگ آبادی۔

وہ اک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

سرسید نے بیشک اس سے بڑا المیہ دیکھا ہوگا۔ عزیزوں کو خاک و خوں میں لتھڑے ، اہل ثروت کو تباہ و برباد ہوتے ، اہل علم کو پامال اور جی حضوریوں کو خوش حال۔ مگر تاریخ کے بے رحم ہاتھ جب ورق الٹتے ہیں تو عالم تہہ و بالا ہوتے ہی ہیں۔ اب اس میں اپنے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن انسان اسی لئے اس کرہ زمین پر باقی رہ گیا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنا طرز عمل بدل لیتا ہے۔ تبدیلی سے جھگڑتا نہیں بلکہ اس سے جس حد تک مطابقت ممکن ہو کرلیتا ہے۔

سرسید کی انگریزی تعلیم کی وکالت ، ایم اے او کالج کے قیام اور ملازمتوں میں کالج کے طلباء کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کا حال سب نے دیکھا اور اسی کو سراہنے والوں نے سراہا اور تنقید کرنے والوں نے برا بھلا بھی کہا۔ نثر میں بھی نظم میں بھی۔

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے

بھرے ہوئے نواب زادے ، شریف زادے ، امیرزادے

اب وقت آگیا ہے کہ ایک اور مسلم یونیور

سرسید کی میراث کو کسی ایک خانہ میں کون سمیٹ سکتا ہے ؟ اس کی جہتیں کثیر ہیں ، اس کا پھیلاؤ ایسا جس کی نہ اور نہ چھور۔ ہم آج ان کی میراث کے اس حصے سے گفتگو کریں گے جس کو ان کی عملی بصیرت نے ان مقاصد پر ترجیح دی جو اس سے زیادہ اہم تھے ۔ ہماری مراد ہے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہے جس کا شمار ہندوستان کی اہم یونیورسٹیوں میں ہے اور جو غالباً عالم اسلام کا سب سے اچھا جدید تعلیمی ادارہ ہے۔

ایم اے او کالج اور کچھ عرصے تک اس کی جانشین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے فرزندوں کے فرط اعتماد ، حسن اطوار ، زندہ دلی ، یک جہتی ، جامہ زیبی ، ادارے سے وابستگی ، کھیلوں میں امتیاز اور شگفتہ مزاجی سے پہچانی جاتی تھی۔ طلبہ عالی ہمت ، نڈر ، مودب اور بے جھجک تھے اور استادوں کے گرویدہ ، اور یہ تعلق خاطر یک طرفہ نہ تھا۔ روایات پتھر کی لکیر بن گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سرسید کی تحریک کا ایک مقصد مسلمانوں میں خود اعتمادی کو بحال کرنا تھا ، دوسرا مقصد انگریزوں کے ساتھ ان کے تعلقات کو استوار کرنا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے اہم مقاصد تھے جن کا ذکر ہم اس وقت نہیں کریں گے۔ یہ دو مقصد باہم گتھے ہوئے تھے۔ اس وقت ریاست کے دو کام تھے ، امن و امان قائم رکھنا اور کاشتکاروں سے زمینداروں کے ذریعہ روپیہ وصول کرنا تاکہ حکومت کرنے کے وسائل فراہم ہوجائیں۔ سرکاری نوکری کا تابع فرمان نظام تعلیم تھا۔ بہ زیادہ تر طالبعلموں کی منزل مقصود بن گئی تھی ۔ مسلمانوں کے دلوں پر سرکاری ملازمت کا سکہ کچھ زیادہ ہی بیٹھ گیا تھا ، وہ دوبار اقتدار سے محروم ہوچکے تھے ۔ پہلی بار تاج و تخت سے ، دوسری بار جب وہ انگریزوں کے مظالم ، عداوت اور انتقام کا ہدف بنے ۔ اس دوسری مصیبت سے انہیں نکلنے میں سرسید کا بڑا ہاتھ تھا۔

جوتھی دہائی نے ابھی آدھا سفر طے کیا تھا کہ حالات دگرگوں ہونے شروع ہوگئے ۔ سیاست نے یونیورسٹی پر شبخون مارا۔ آزادی اور تقسیم کا شور ایسا مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایک دروازے سے سیاست داخل ہوئی ، دوسرے سے یونیورسٹی کی

ایک دروازے سے سیاست داخل ہوئی ، دوسرے سے یونیورسٹی کی قدریں اور روایتیں باہر چلی گئیں۔ ادب ، خوش اطواری ، احترام ، نظم و ضبط ، اعتماد ، اڈتی ہوئی خیر اندیشی ، ہمہ گیر شادمانی ، شوخی ، ظرافت ، برجستگی ، خوش ذوقی۔ ایک بار یہ خانہ بدر ہوگئیں تو پھر (اس انداز سے) واپس نہ آئیں۔

قدریں اور روایتیں باہر چلی گئیں۔ ادب ، خوش اطواری ، احترام ، نظم و ضبط ، اعتماد ، اڈتی ہوئی خیر اندیشی ، ہمہ گیر شادمانی ، شوخی ، ظرافت ، برجستگی ، خوش ذوقی۔ ایک بار یہ خانہ بدر ہوگئیں تو پھر (اس انداز سے) واپس نہ آئیں۔ وائس چانسلر کا احترام اٹھ گیا ، وہ اٹھ گیا تو یونیورسٹی میں کیا باقی رہا۔ ہمارا ایک بہت بڑا وائس چانسلر مسلم لیگ اور حکومت کے دو پاٹوں کے بیچ میں آگیا۔

ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کے طالب علم اپنے ہی ملک میں جہاں وہ سربلند رہ چکے تھے ، مشتبہ ہوگئے ۔ نہ وہ زمیں رہی نہ وہ آسماں رہا۔ یونیورسٹی کی بقا کے لالے پڑگئے ۔ پنڈت نہرو ، مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کی دستگیری کی ۔ آخرالذکر نے اسے سنبھالا۔ اعتماد ، شہرت اور عافیت بحال کی اور معیار کی بازیابی کے جتن کئے لیکن روایتیں مسمار ہوچکی تھیں ، لپو منہ کو لگ چکا تھا۔ جنہوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے محسن کو نہیں چھوڑا وہ ان کے جانشینوں کو خاطر میں کب لاتے ۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور اس کے سربراہ کی عزت اور خیر خواہی مسمار ہوگئی ، جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا طرہ امتیاز اور اس کی طاقت کا راز تھی ، تو پھر بچا کیا ؟ ۔ خاندان کے سربراہ کی عزت گئی تو کس کی باقی رہی ؟ ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پچھلے 48 سالوں میں یونیورسٹی کی نہج اور اس کی افتادِ طبع اور زاویہ نگاہ سب بدل گیا۔ ایسا ہونا ایک قدرتی عمل تھا۔ یونیورسٹی میں زبردست توسیع ہوئی ۔ اس کی پوری ذمہ داری مرکزی حکومت نے اختیار کرلی۔ اس کا سالانہ بجٹ نصف ارب کے قریب پہنچ گیا۔ نئی فیکلٹیاں قائم ہوئیں ، مت بہت سے نئے ڈپارٹمنٹ کھل گئے ۔ بڑی بڑی جدید عمارتیں کھڑی کردی گئیں۔ طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ۔ ڈھائی ہزار سے پانچ ہزار اور پھر بتدریج بیس بائیس ہزار۔ بہت سے نئے ہال قائم ہوئے ، بڑی تعداد میں ہوسٹل کھل گئے ۔ اساتذہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے آگے نکل گئی۔ غیر تدریسی عملہ پانچ ہزار کو پیچھے چھوڑ گیا۔ نئے نئے تعلیمی تجربات ہوئے۔ سب سے اہم اضافے جنہیں آزادی کے دور کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج کا قیام ہے ۔ انجینئرنگ کالج کھل تو آزادی سے پہلے گیا تھا لیکن اس کی بڑی توسیعات آزادی کے بعد وجود میں آئیں ۔ ان کالجوں نے ساری دنیا کو اپنے فرزندوں کے زیر قدم کردیا ۔ دنیا کے کسی قابل ذکر ملک میں چلے جائیے علیگڑھ کے ابنائے قدیم آپ کی پذیرائی کے لئے موجود ہوں گے ۔ یہ بھی انوکھی بات ہے کہ علیگڑھ کے سابق طالب علم اپنی مادر علمی سے جتنے فاصلے پر ہوں گے اتنی ہی اس کے ساتھ ان کی وابستگی زیادہ ہوگی۔ جتنے قریب ہوں گے دل میں اتنے ہی دور ہوں گے اور ان کا ذاتی مفاد یونیورسٹی کے مفاد پر غالب آتا چلا جائے گا۔ یہ کلیہ تجربے کی بنیاد پر خود بخود بن گیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ثابت کرنے کے لئے مستثنیات جابجا مل جائیں گی۔

جیسا کہ قارئین کرام نے اندازہ لگایا ہوگا آزادی کے بعد سال بہ سال طلبہ کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس پر روک لگانے میں جان کا ، جان کا نہ سہی ، عزت و عافیت کا جوکھم ضرور تھا۔ ایسے سرپھرے کم ہوتے ہیں جو بیٹھے

وکٹور

بٹھائے اس طرح کا جوکھوں مول لے لیں۔ اس دلیل کا کیا جواب کہ یہ ہماری یونیورسٹی ہے ، ہمارے بچے اس میں داخل نہ ہوں گے تو کہاں جائیں گے ۔ انہیں کوئی کس طرح سمجھاتا کہ یونیورسٹی کسب فضیلت کے لئے قائم کی گئی ہے ، زبونی معیار کے لئے نہیں۔ معیار اور مقدار میں جنگ ہوتی رہی ، رن بالعموم مقدار نے جیتا۔ کسی نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اقامتی اور غیر الحاقی جامعہ کا ایک موزوں حجم ہوتا ہے ۔ اس سے تجاوز کیا جائے تو یونیورسٹی کا انتظام تدریس و تحقیق ، اطوار و اخلاق ، سب متاثر ہونے لگتے ہیں ۔ طلبہ کی تعداد اگر ادارہ کی تدریسی اور اقامتی صلاحیت سے زیادہ ہوجاتی ہے تو

کیا مسلم یونیورسٹی صرف ڈگر

تحریر : محمد حسن

بے شک سرسید کی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی پہچان بنائی ہے آج وہاں انجینئرنگ کالج بھی ہے میڈیکل کالج بھی ہے کمپیوٹر سینٹر بھی بھلا برا قائم ہوگیا ہے مگر کیا وہ سائنٹفک نقطہ نظر بھی وہاں عام ہوا ہے جس کے بغیر ان شعبوں میں بھی خاطر خواہ ترقی ممکن نہیں۔

مگر سچ یہ ہے کہ سرسید کے دل کی بات سمجھنا اب بھی باقی ہے ممکن ہے یہ بات سرسید کی تحریر و تقریر میں اس قدر واشگاف انداز سے ظاہر نہ ہوئی ہو مگر سرسید کے اعمال و افکار سے واضح طور پر جھلکتی ہے۔

سرسید نے اخبار نکالا اس کا نام رکھا علی گڑھ سائنٹفک گزٹ ۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کا مقصد سائنسی نقطہ نظر سے زندگی کو سمجھنا اور اس کے تقاضوں کا جائزہ لینا تھا۔ انہوں نے صرف جائزہ لینے پر بس نہیں کی بلکہ اس سائنسی تجزیے سے جو نتیجے نکلے ان پر حتی الوسع عمل بھی کیا۔ اور اس کا نتیجہ تھا ایم اے او کالج جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کہلاتا ہے۔

سائنس کا پہلا سبق یہی ہے کہ اپنے ارمان اور خواہشات کو ایک کنارے رکھ کر خارجی حقیقت کا جائزہ لیجئے اور اسی کے مطابق عمل کیجئے اب اس میں جو کچھ اپنے پر بیتے اسے سہنے اور برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسی کو سائنس کی معروضات کہا جاتا ہے مگر کتنے ہیں جو اپنے محبوب تصورات اور جذبات کو ایک طرف رکھ کر حقیقت سے اس طرح آنکھیں چار کرسکتے ہیں۔

محض انگریزی پڑھنے پڑھانے اور اپنے طلبا کو کرنیل جرنیل بنکر خوش نہیں ہوتے بلکہ ان کے ذہن اور ان کے عمل میں اس سائنٹفک طرز عمل کی جھلک بھی دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے نزدیک بدلتی ہوئی زندگی کا منشور تھا اور ہے۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آدمی کٹی پتنگ کی طرح ہوا کے ہر رخ پر اپنی روش بدلتا رہے مگر اس کا یہ مقصد ضرور ہے کہ کبھی کبھی حالات ایسا فیصلہ کن موڑ لیتے ہیں کہ اس کے جبر کے مقابلے میں اپنی پرانی روش پر اڑے رہنا بندریا کی طرح اپنے بچے کی لاش لپٹائے ہوئے گھومنے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہوجاتا ہے ۔ اقبال نے یوں ہی نہیں کہا تھا۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اور سچ جانئے یہ منزل محض قوموں ہی کی زندگی میں کٹھن ہے افراد کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ کٹھن ہے

سرسید کے سامنے ایک سیدھا صاف سوال تھا انگریزوں کی فتح کا بنیادی سبب کیا تھا ؟ فروعی اسباب تو بہت سے تھے ۔ انتظامی بدحالی ۔ آپس کی پھوٹ ۔ اندرونی بغاوتیں وغیرہ وغیرہ لیکن بنیادی سبب تھا سائنس جس کے استعمال نے صرف ذہن اور کردار ہی میں ایک نئی پختگی پیدا نہیں کی تھی بلکہ ہتھیاروں کی تیاری ، حکمت عملی کے انتخاب اور زندگی کی روش میں انگریزوں کو فوقیت دے دی تھی ۔ اس کے معنی تھے عقل کی بادشاہت اور حکیمانہ فکر کی بالادستی ۔ اور اسی لئے سرسید کے پہلے اخبار کا نام تھا۔ سائنٹفک گزٹ۔

ذرا غور کیجئے تو بات آج بھی صحیح ہے ۔ ایشیا کی پسماندگی ہو یا ہندوستان کی مفلسی ۔ فرقہ پرستی کا کھیل ہو یا انسانی قدروں کی پامالی ۔ ہر دردناک حادثے کے پیچھے ہی درماندگی چھپی ہوئی ہے اور یہ اسی وقت دور ہوگی جب

اس شمارے کی قیمت چار روپئے
سالانہ چندہ ایک سو پچاس روپئے / چالیس امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر ، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز انٹرنیشنل
49 ابوالفضل انکلیو ،
جامعہ نگر ، نئی دہلی۔25 سے شائع کیا
فون : 6827018
سری نگر بذریعہ ہوائی جہاز 50۔4 روپے

...رسٹی کے قیام کا ڈول ڈالا جائے

ملی ٹائمز کے لئے خصوصی طور پر لکھے گئے سید حامد کے مضمون کے اہم اقتباسات پر مشتمل

فساد رونما ہوتا ہے، فتنہ سر اٹھاتا ہے۔ ہوسٹل جو یونیورسٹی کا محور ہوتے ہیں، سرائے بن جاتے ہیں۔ سرائے میں پڑھائی کا ماحول کس نے دیکھا ہے؟۔ جس کمرے میں تین طالب علموں کی جگہ ہو وہاں اگر چھ رہنے لگیں تو گھٹن تو محسوس ہوگی ہی، چلنا پھرنا، سانس لینا دوبھر ہوجائے گا۔ باتوں کا شوق اس پر مستزاد۔ ایسے ماحول میں کوئی پڑھنا چاہے بھی تو کیسے پڑھے۔ مولانا آزاد لائبریری میں رات گئے بلکہ منہ اندھیرے تک جو ہجوم رہتا ہے اس کی وجہ پڑھائی کے شوق کے علاوہ

...گیٹ

ہوسٹلوں کی تنگ دامانی اور حشر سامانی بھی ہے۔ داخلے جب اقامتی اور تدریسی گنجائش سے زیادہ ہوں گے تو فاضل طلبہ کے علاوہ بد عنوانیاں بھی نت نئے عنوان تلاش کرکے داخل ہوجائیں گی۔ نقار خانے میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ہنگامہ پروری سنجیدگی کو دبا دیتی ہے۔ تن آسانی ریاضت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ گفتگو کا بے مصرف مشغلہ پڑھائی کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ ایک کمرے میں بساط سے زیادہ طالب علم رہیں گے اور ان کے ملنے والے بھی آتے رہیں گے تو کوئی طالب علم یکسوئی کے ساتھ پڑھ نہیں پائے گا۔ اسی طرح لیکچر روم میں استاد اور کمرے کی صلاحیت سے زیادہ طلبہ خود کو استاد کی توجہ سے محروم کردیتے ہیں۔

والدین اگر شروع سے ہی بچوں کی تعلیم کی طرف دھیان دیں اور قرب و جوار کے اچھے اسکولوں اور کالجوں میں ان کے داخلے کی کوشش کریں تو ہماری یونیورسٹی ایک بڑے بوجھ سے بچ جائے اور تعداد اور اس کے مسائل میں الجھ جانے کے بجائے یونیورسٹی کے ارتقاء اور طلبہ کے امکانات اور ان کی شخصیت کے نشو و نما کی طرف یکسوئی کے ساتھ توجہ دی جاسکے۔ اگر خیال یہ ہو کہ بڑھی ہوئی تعداد کو گھٹایا نہیں جاسکتا تو یہ قدم تو ہم اٹھا ہی سکتے ہیں کہ تعداد کو اور نہ بڑھنے دیں اور گھٹانے کے عمل کو تدریج میں ڈھال کر بے خراش بنادیں۔ الغرض علیگڑھ مسلم یونیورسٹی مقدار کے اس بار گراں کی جو وہ ڈھورہی ہے متحمل نہیں ہوسکتی۔ ہمیں سنجیدگی اور عزم کے ساتھ ایک دوسری مسلم یونیورسٹی کو وجود میں لانا چاہئے، جو دکن یا جنوب میں کھولی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کا ایک قلعہ اب جنوب میں بننا چاہئے۔ نئی یونیورسٹی کو ان انقلابات کا حامل ہونا چاہئے جو علوم اور ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ میں رونما ہوئے ہیں۔ چونکہ اب پالیسی کا رخ یونیورسٹیوں کی پرائیویٹ گری کی جانب موڑا جارہا ہے، ہمیں اپنی دوسری یونیورسٹی کا جھکاؤ سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف شروع سے ہی کردینا چاہئے۔ اس ادارہ کو تاخیر سے وجود میں آنے کا فائدہ پوری طرح نہ پہنچایا گیا تو ہم پر آفریں۔ علوم اور ٹکنالوجی خصوصاً ابلاغیات میں جو ہوشربا تبدیلیاں ہورہی ہیں وہ سب اس یونیورسٹی کو جذب اور منتشر کرنا ہوں گی۔ اس پر مستزاد یہ اہتمام کہ مستقبل میں ہونے والی تبدیلیوں کے لئے اس کے دروازے اور سانچے کھلے رہیں۔ ایک دوسری یونیورسٹی کا قائم ہونا نو بہ نو مضامین کو شامل کرنے اور ہماری تعلیم کو ایک بالکل نیا رخ دینے کے لئے بھی ضروری ہوگا۔ سرسید اس زمانے میں ہوتے یا کوئی ایسا رہنما جو ان کی بصیرت کا سواں حصہ بھی رکھتا ہو تو یہ دوسری جدید ترین یونیورسٹی کبھی کی وجود میں آچکی ہوتی۔

طلبہ کی کثرت تعداد کے بعد جس چیز نے سید والا گہر کی میراث کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا وہ یونیورسٹی میں داخلی نسل کشی ہے۔ بارہ تیرہ سال ہوگئے حکومت نے ایک کمیٹی مرکزی یونیورسٹیوں کی کارکردگی پر نظرثانی کرنے کے لئے بنائی تھی۔ اس کی رپورٹ نے (ہمارے لئے) یہ شرمناک انکشاف کیا کہ سب سے زیادہ داخلی نسل کشی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہورہی ہے۔ اندھا بانٹے ریوڑی اپنوں ہی کو دے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرابت (حالیہ یا متوقع) کو صلاحیت پر ترجیح دی گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ تدریس و تحقیق کا معیار گرگیا۔ ایک طرف لڑکے جگہ کی تنگی کے فشار میں، دوسری طرف استاد نالائق عزیزوں کے درپئے انتخاب۔ بہانہ یہ کہ تناسب اور کردار کو برقرار رکھنا ہے۔ یہ سب تسلیم۔ لیکن کس قیمت پر اور کس مقصد کے لئے۔ اس کلیہ سے آپ واقف ہی ہوں گے کہ نالائق سربراہ لائق ماتحتوں کا نہ گرویدہ ہوتا ہے، نہ انہیں گوارا کرپاتا ہے۔ وہ نالائقوں کا انتخاب کرکے ہی اطمینان کا سانس لے سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسکولوں اور یونیورسٹی کے معیار میں جو گراوٹ آئی ہے وہ قرابتوں، سفارشوں، مروتوں، سازشوں کی راہ سے بھی آئی ہے۔ صلاحیت سے کسی قیمت پر اگر مفاہمت نہ کی جاتی تو بہترین استادوں کا انتخاب ہوتا اور طلبہ بھی اچھے داخل کئے جاتے۔ علیگڑھ میں ایک بہانہ یہ بھی بد عنوانی اور اقربا پروری کے لئے بنایا جاتا ہے کہ اگر مسلمان مامور نہ ہوتے تو یونیورسٹی کا اسلامی کردار باقی نہ رہ سکے گا۔

اس کے باوجود ایسا بھی ہوتا ہے کہ باہر کے بہتر اور زیادہ موزوں مسلمان رد کردئے جاتے ہیں اور یونیورسٹی کے اپنے طلبہ یا اساتذہ بالترتیب پہلے تقرر (لکچرر) یا دوسرے اور تیسرے تقرر (ریڈر اور پروفیسر) کے لئے باوجود نااہل یا ناموزوں ہونے کے چن لئے جاتے ہیں۔ اسلام کے نام پر خاندان یا شاگردان رشید کی پرورش کی جاتی ہے۔

اتنی بات یہاں اور صاف کردی جائے کہ قرابت اگر ایک بار صلاحیت پر غالب آگئی تو پھر اس طریق کار کو وہ لوگ بھی اختیار کرنے لگتے ہیں جو ابتدائی عذر سے محروم ہیں۔ قرابت اصولوں پر غالب آگئی تو وہ لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ جو اسلامی کردار کی بقا کے لئے فکر مند نہیں ہیں۔ چنانچہ علیگڑھ میں ایسا ہی ہوا۔

ستم یہ ہے کہ اب ایک عرصے سے یونیورسٹی کی مت سے تقویت نہیں ملی، جراحت پہنچی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی گذشتہ بارہ سال کی روداد سن پڑھ ڈالئے، آپ کو چھوٹی چھوٹی ہنگامی اور ہنگامہ خیز باتوں، قانونی موشگافیوں اور خانہ جنگیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ یونیورسٹی کی فلاح کے لئے کیا سروسامان کئے جائیں،

بقیہ صفحہ ۱۲ پر

یہ بھی انوکھی بات ہے کہ علیگڑھ کے سابق طالب علم اپنی مادر علمی سے جتنے فاصلے پر ہوں گے اتنی ہی اس کے ساتھ ان کی وابستگی زیادہ ہوگی۔ جتنے قریب ہوں گے دل میں اتنے ہی دور ہوں گے اور ان کا ذاتی مفاد یونیورسٹی کے مفاد پر غالب آتا چلا جائے گا۔

...یاں بانٹنے کے لئے قائم کی گئی تھی؟

پوری قوم کو حکیمانہ اور سائنٹفک نقطہ نظر ملے۔

محض تعلیم ادھورا لفظ ہے اول تو تعلیم کیسی ہی عالمانہ کیوں نہ ہو اس وقت تک محض فضول ہے جب تک وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ نہ

مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ

سکھائے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی بندھا ٹکا سلیقہ نہیں کہ ایک نسل نے سیکھ لیا تو آنے والی نسلوں تک کفایت کرے گا۔ یہ تو عمل اور رد عمل کا ایک سلسلہ ہے جو ہر دور کے ساتھ نئی للکار کے ساتھ ابھرتا بھی ہے اور نئے قسم کی قبولیت پر اصرار بھی کرتا ہے اسی لئے ہمارے دور کے ممتاز ترین مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اسے للکارا اور اس کے پیدا کردہ تاثر Challenge اور Response کو اصطلاحوں سے ظاہر کیا ہے۔

آج کے معاشرے کی کلید ہے سائنس اور یہ "آج" اتنا طول پکڑ گیا ہے کہ جو دن سرسید کے دور میں طلوع ہوا تھا اب تک جاری ہے لیکن ابھی تک ہمارے ملک اور ہماری قوم نے اس جیتی جاگتی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے۔ سائنس محض سمجھنے کی بات ہے بھی نہیں یہاں سوال زمانے کی "بے رحم" حقیقتوں کو پہچاننے کا ہے اور ان کے مطابق خود کو ڈھالنے کا ہے۔ جنہیں بدل سکیں انہیں بدلیں جنہیں نہ بدل سکیں انہیں اختیار کریں۔

اب ذرا اسی بات کو ہی لے لیجئے۔ کل جو حیثیت انگریزی تعلیم اور سائنسی جانکاری کی تھی آج کم و بیش وہی حال کمپیوٹر کا ہے آپ کمپیوٹر کے ذریعے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو آج کے دور میں نئے فیصلوں تک پہنچنے اور ان پر عملدرآمد کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کرسکتے ہیں اور اس کمپیوٹر کے ذریعے آگے بڑھتی ہوئی دنیا کی لگام آپ کے ہاتھ میں بھی آسکتی ہے

سرسید احمد خاں نے اپنے زمانے ہی کو نہیں پہچانا تھا بلکہ آنے والے دور کی سمت و رفتار کا اندازہ کرلیا تھا۔ انہوں نے مغرب کی فتح مندی اور مشرق کی شکست کے اسباب کو محض آپسی جھگڑوں اور سیاسی خلفشار تک محدود نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے کارفرما قدروں کی شکست و ریخت اور نئی اقدار کی تشکیل کے عمل کو بھی پہچانا تھا اسی لئے وہ محض انگریزی پڑھنے پڑھانے اور اپنے طلبا کو کرنیل جرنیل بناکر ان کے سینوں پر جگمگاتے تمغے دیکھ کر ہی خوش نہیں ہوتے بلکہ ان کے ذہن اور عمل میں اس سائنٹفک طرز عمل کی جھلک بھی دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے نزدیک بدلتی ہوئی زندگی کا منشور تھا۔ اور ہے۔

اور اس راہ میں آج بھی کوئی حائل نہیں ہوسکتا۔ سائنس نئے دور کا مزاج ہے تیزی سے نہ سہی آہستہ روی کے ساتھ سہی یہ ہماری زندگی پر ضرور اثرانداز ہوگا اور جو لوگ سائنس کے اس منصب کو سمجھتے ہیں اور اس کی معنویت کا وسیع تر ادراک رکھتے ہیں وہ اس کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بھی ناواقف نہیں ہوں گے اور نئے دور پر اپنا نشان ضرور ثبت کریں گے

بے شک سرسید کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنی پہچان بنائی ہے آج وہاں انجینئرنگ کالج بھی ہے میڈیکل کالج بھی ہے کمپیوٹر سنٹر بھی بھلا برا قائم ہوگیا ہے مگر کیا وہ سائنٹفک نقطہ نظر بھی وہاں عام ہوا ہے جس کے بغیر ان شعبوں میں بھی خاطر خواہ ترقی ممکن نہیں۔

اس سائنٹفک نقطہ نظر کے لئے جو سرسید کی بنیادی وراثت ہے علی گڑھ یونیورسٹی کیا کررہی ہے۔ ظاہر ہے کام مشکل ہے اور اس کے لئے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ سب کے سب صرف یونیورسٹی فراہم نہیں کرسکتی البتہ مقصد واضح اور منزل طے ہو تو راستے آسان اور ذرائع حاصل ہوجاتے ہیں۔ لیکن کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح لشتم پشتم ڈگریاں بانٹنے اور کانووکیشن کرنے تک خود کو محدود رکھے گی یا سرسید کی وراثت کو پورا کرے گی اور اس سائنسی نقطہ نظر کو اپنائے گی اور عام کرے گی جس کے بغیر وہ آج بھی وقت کی اہم ضرورت کی تکمیل نہیں کرسکتی۔

رکاوٹیں بہت تھیں الزامات کا طوفان تھا، برا بھلا کہنے والوں کی کثرت تھی۔ مگر وہ اکیلا سب رکاوٹیں پار کرتا چلا گیا۔ آج بھی علیگڑھ کو اسی استقامت اور دور بینی کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ اس راہ میں رکاوٹیں بہت ہیں خصوصاً ایسے ملک اور معاشرے میں جس کا رخ ہی پیچھے کی طرف ہو ماضی اس کے کندھے پر سوار ہو اور جہاں رجعت پسندی اس قدر حاوی ہے کہ جب چاہے پورے ملک اور معاشرے کو بے بنیاد ماضی پرستی میں مبتلا کرکے پوری قوم کے قدم آگے بڑھنے سے روک دے مگر سرسید احمد خاں نے تو اس سے بھی زیادہ ہمت شکن اور بھیانک حالات میں کام شروع کیا تھا۔ رکاوٹیں بہت تھیں، الزامات کا طوفان تھا، برا بھلا کہنے والوں کی کثرت تھی۔ مگر وہ اکیلا سب رکاوٹیں پار کرتا چلا گیا۔ آج بھی علی گڑھ کو اسی استقامت اور دور بینی کی ضرورت ہے مگر سب سے پہلے ضروری ہے مقصد کا واضح ہونا۔

زندہ قومیں محض ماضی میں زندہ نہیں رہتیں۔

زندہ قومیں محض ماضی میں زندہ نہیں رہتیں۔ سرسید نے یہ سبق صاف اور واضح لفظوں میں سکھایا ہے جو لوگ محض علیگڑھ کے اینٹ پتھروں سے والہانہ محبت کرتے ہیں ان کی خوش عقیدگی کو سلام ہو، مگر وہ عقیدہ کیا جو محض راستے روکنے کے کام آئے۔

سرسید نے یہ سبق صاف اور واضح لفظوں میں سکھایا ہے جو لوگ محض علی گڑھ کے اینٹ پتھروں سے والہانہ محبت کرتے ہیں ان کی خوش عقیدگی کو سلام ہو، مگر وہ عقیدہ کیا جو محض راستے روکنے کے کام آئے۔ ضرورت تو یہ ہے کہ زمانے کے رخ کو پہچان کر آگے بڑھا جائے اور اس دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھ کر مثال قائم کی جائے۔ سرسید کی وراثت کا تقاضا بھی یہی ہے اور وقت کی آواز بھی یہی ہے۔

سرسید نے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ

انہوں نے مستقبل کی نسلوں کے لئے ایک نقش عمل بھی چھوڑا

ڈاکٹر نجیب اختر - سنٹر آف انڈین لینگویجز۔
جواہر لال نہرو یونیورسٹی

سرسید کا ذکر آتا ہے تو ذہن میں ایک ایسی بھاری بھرکم اور جامع کمالات شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے جس نے نہ صرف اپنے پورے عہد کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک نقش عمل بھی چھوڑا۔ وہ اپنے دور کی سب سے قد آور شخصیت تھے۔ ان کی دور بیں نگاہوں نے مستقبل کے حالات کی نزاکت اور سنگینی کا ادراک کرلیا تھا۔ اور وہ آنے والے کل کی سفاکی کو محسوس کر رہے تھے۔ آپ ذرا ماضی کی طرف لوٹ چلیں اور اس وقت کے حالات پر غور کریں۔ مسلمان کل تک جس اقتدار کے تنہا وارث تھے اس سے محروم ہوچکے تھے۔ جاہ و جلال، شان و شوکت رخصت ہوچکا تھا۔ کل تک جو حاکم تھے آج محکوم بنا دیے گئے۔ پوری قوم مایوسی اور اضمحلال کا شکار ہوگئی تھی۔ انگریزوں نے چونکہ اقتدار مسلمانوں سے حاصل کیا تھا اس لئے وہ مسلمانوں کو اپنا حریف اور اپنے اقتدار کے لئے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ لہذا مسلمان براہ راست ان کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہتے۔ یہی وہ صورت حال تھی جس نے سرسید کو جنم دیا۔ گویا سرسید اس بحران کے پیدا کردہ تھے۔ ایسی صورت میں اپنی قوم کی بہتری کے لئے کچھ سوچنا اور کرگزرنے کا حوصلہ کرنا ایک غیر معمولی بات ٹھہرتی ہے۔ اور اسی سے سرسید کی غیر معمولی قوت ارادی اور آہنی حوصلہ کا احساس ہوتا ہے اور یہی چیزیں سرسید کو بڑا بناتی ہیں۔ عظیم شخصیتیں ہمیشہ وقت کے دھارے کے خلاف چلتی ہیں وہ حالات کے رحم و کرم پر نہیں جیتیں بلکہ وقت اور حالات کا رخ اپنے مطابق موڑ لیتی ہیں۔

سرسید نے اس غیر معمولی صورت حال سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دکھایا۔ ان کے سامنے دو اہم مسئلے تھے۔ پہلا تو یہ کہ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دل میں نفرت کی جو آگ سلگ رہی ہے وہ ٹھنڈی کی جائے اس کے بغیر ان کے خیال میں کوئی بھی اصلاحی اور تعمیری کام سودمند نہیں ہوسکتا تھا۔ لہذا انہوں نے انگریزوں سے رابطے استوار کئے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی حالانکہ ان کی شخصیت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا۔ پھبتیاں کسی گئیں، طعنے دیے گئے کفر کے فتوے لگے، انگریزوں کا دلال اور ایجنٹ کہا گیا لیکن ان کے خلوص، سچی لگن اور جذبہ صداقت نے ان باتوں کا ذرا بھی برا نہیں مانا بلکہ انہوں نے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر مسلمانوں کی بے گناہی کی بھرپور وکالت اور مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی نفرت کم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

سرسید مسلمانوں کو اس بحران اور کرائسس سے نکلنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ بھی نئے علوم اور جدید سائنسی افکار و نظریات سے واقف ہوں۔ "تعلیم" ان کے نزدیک بنیادی سرچشمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بغیر کسی انقلابی تبدیلی کا خیال، خیال محض سے زیادہ نہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے علی گڑھ میں ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی اور لوگوں کو جدید تعلیم کی اہمیت اور اس کی برکتوں کی طرف متوجہ کیا۔

اس ادارہ کے قیام کے ذریعے سرسید اپنی قوم کو ایک پیغام دینا چاہتے تھے۔ ان کے اندر ایک تحریک پیدا کرنا چاہتے تھے، انہیں بیدار کرنا چاہتے تھے، ان کے اندر تعلیمی شعور جگانا چاہتے تھے کہ مسلمان اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ اپنے عقل و شعور کے دروازے بند کرکے نہ سوچیں۔ زمانے کی نبض اور رفتار کو پہچانیں۔ اپنے دور کے رائج الوقت سکے کو پرکھیں اور یہی میرے نزدیک سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کی اہمیت اور تعلیم کا شعور بیدار کیا اور اپنی قوم کو اس طرف متوجہ کرنے میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

> "تعلیم" ان کے نزدیک بنیادی سرچشمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بغیر کسی انقلابی تبدیلی کا خیال، خیال محض سے زیادہ نہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے علی گڑھ میں ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی اور لوگوں کو جدید تعلیم کی اہمیت اور اس کی برکتوں کی طرف متوجہ کیا

سرسید تعلیم کے ذریعہ ڈسپلن اور مہذب معاشرہ کا قیام چاہتے تھے۔ وہ نظم و ضبط کی سختی سے پابندی چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں تعلیم شخصیت کی ترتیب و تہذیب کا بہتر وسیلہ ہے اس لئے تعلیم انسان کے غیر انسانی افعال کی تزئین و تہذیب کرکے ایک اچھا شہری بناتی ہے۔ گویا سرسید تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ خوبیوں سے متصف انسان بھی دیکھنا چاہتے تھے۔

ان کی یہ آرزومندی کس حد تک پوری ہوئی، کیا آج علیگڑھ سرسید کے خوابوں کا علی گڑھ ہے؟ سرسید جس طرح جدید علوم و فنون میں امتیاز کمال دیکھنا چاہتے تھے کیا وہ پوری ہوئیں؟ کیا علیگڑھ کا معاشرہ ایک ڈسپلن معاشرہ بن سکا؟۔ ایک اچھے شہری اور مہذب انسان کی تعمیر و تشکیل میں علیگڑھ اپنے فرائض سے کس حد تک عہدہ برآ ہوسکا؟۔ یہ وہ سوالات ہیں جو سرسید کی روح بیتاب ہم سبھوں سے کررہی ہے اور اس کا جواب چاہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے علیگڑھ کے کردار پر ایک سوالیہ نشان سا لگا ہوا ہے۔ اب تک اسے کوئی ایسا دردمند، سچا اور مخلص سرپرست نہیں مل سکا ہے جو یہ دیکھے کہ اس کو کہاں گھن لگ رہا ہے۔ کون سا مرض لاحق ہے۔ اس کے صحیح مرض کی تشخیص کرے اور اس کے علاج کی مخلصانہ کاوش کرے۔ سرسید نے تعلیم کی جو ایک فضا قائم کی تھی۔ علم حاصل کرنے کی جو ایک سچی لگن اور ذوق و شوق کو جو مہمیز عطا کی تھی۔ اور جس معیار اور کمال فن کی آرزو کی تھی، آج علیگڑھ میں اس کا فقدان ہے

اس صورت حال میں وائس چانسلر، اساتذہ اور انتظامیہ کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ طلباء اپنی تعلیم کی طرف توجہ دیں، غیر ضروری امور اور سیاست سے اپنے کو دور رکھیں اور ان کا ایک نکاتی پروگرام ہونا چاہئے تحصیل علم اور بس۔

موجودہ وائس چانسلر کے لئے علی گڑھ کی ذمہ داری جہاں ایک بڑا اعزاز ہے وہیں ان کے لئے ایک بڑا چیلنج بھی ہے۔ اس کھوئے ہوئے علیگڑھ کی بازیافت، جس میں سرسید اور ان کے رفقاء کے خواب دفن ہیں اور اس وراثت کو پھر سے حاصل کرکے آنے والی نسلوں کے سپرد کرنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن بہت مشکل بھی نہیں ہے صرف عزم، حوصلہ، خلوص اور سچے لگن کی ضرورت ہے۔ وائس چانسلر صاحب کو ہوا بند کمرے سے نکل کر طلباء اور اساتذہ سے براہ راست رابطہ استوار کرنا چاہئے۔ ان کے مسائل سے براہ راست واقفیت اور ان کے حل کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایڈمنسٹریٹر کے بجائے ایک شفیق باپ کی حیثیت سے پیش آنا چاہئے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ وائس چانسلر کے گرد ایک پاور گروپ ان کو اپنے حلقے میں لے لیتا ہے جس کی وجہ سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں موجودہ وائس چانسلر کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔ کھوئے ہوئے علیگڑھ کی بازیافت، جس میں ایک تعلیمی فضا پھر سے قائم ہو، علم کے متلاشیوں کا ایک بڑا مرکز بنے۔ لوگ کمال امتیاز حاصل کریں۔ ایک منظم اور مہذب ماحول اور فضا قائم ہو، ایک دوسرے کے لئے احترام و عقیدت کا جذبہ ہو، خلوص و محبت کا ایک ماحول پھر سے بنے۔ دراصل سرسید کو سب سے بڑا اور سچا خراج عقیدت یہی ہے۔

بقیہ: سید حامد کی خصوصی تحریر

ترقی کن خطوط پر دی جائے، اس کا معیار تدریس و تحقیق کس طرح بڑھایا جائے، اس کے طلبہ کی پرداخت، ان کی شخصیت کی نشو و نما کیوں کر ہو۔ رودادوں کے پنے پلٹتے جائیے، ان امور کی آہٹ بھی آپ کو نہیں ملے گی۔ ملے گی تو وائس چانسلر کے خلاف محاذ آرائی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وائس چانسلر کو چھان پھٹک کر چنو، اور ایک بار چن لیا ہے تو اسے یکسوئی اور اعتماد کے ساتھ کام کرنے دو۔ جو طلبہ اس کے نظام سے سرتابی کرتے ہیں انہیں منہ نہ لگاؤ۔ یہ ہوا کھڑا نہ کرو کہ سرکار یونیورسٹی میں مداخلت کرتی ہے، جو لوگ، عوام کے جو نمائندے، دراصل مداخلت کرتے ہیں انہیں روکو۔ ان کے خلاف رائے عامہ بناؤ۔ ایک عرصے تک طلبہ کے حق نمائندگی اور حق رائے دہی دونوں کو محدود کرنا پڑے گا۔ جن طلبہ کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی ہے اور ان کی خطا پایہ ثبوت کو پہنچی ہے۔ یا جو طلبہ اپنے دوران قیام میں ایک بار سے زیادہ ناکام ہوئے ہیں، ووٹروں کی فہرست سے ان کا نام خارج کردیا جائے۔ اور یونین کی عہدہ داری کے لئے وہی طلبہ کھڑے ہوسکیں جو آخری امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ طلبہ کی یونین کا رخ اور رجحان اور اس کا وصف رکنیت بدل جائے تو سمجھ لیجئے کہ آدھی لڑائی جیت لی گئی۔ اس نوع کی کئی اصلاحیں انتظامی احکام کے ذریعہ معرض عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔

لیکن کچھ ضروری اصلاحیں ایسی بھی ہیں جو یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کی طالب ہوں گی۔ ان میں سب سے زیادہ ضروری ہے وائس چانسلر کے طریق انتخاب میں ترمیم۔ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں یہ انتخاب آخر تک معرض اخفا میں رہتا ہے۔

کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں مجلس منتظمہ براہ راست پانچ نام ایسے قلمبند کرتی ہے جن میں سے تین یا چار کو یونیورسٹی کورٹ وزیٹر (یا چانسلر) کے پاس بھیجتا ہے جو ان میں سے بالآخر ایک کو منتخب کرلیتا ہے۔

یہ طرز انتخاب ہونے والے وائس چانسلر بلکہ اس منصب کے وقار کو مٹی میں ملادیتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کورٹ میں ایک حلقہ انتخاب معطی صاحبان کا بھی ہے، ایک یونیورسٹی کے ابنائے قدیم کا، ایک آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا، ایک کرمچاریوں کا وغیرہ وغیرہ۔ ان حلقوں سے اب تک جو افراد چن کر آتے ہیں وہ کورٹ میں بالعموم گرمی تو پیدا کرسکے ہیں، اسے روشنی نہیں دے سکے۔

کورٹ کو 6 ممبر ایکزیکٹیو کونسل میں بھیجنے کا اختیار ہے۔ کورٹ کا قوام درست ہوجائے تو نمائندگی کی یہ تعداد مضر ہونے کے بجائے مفید ثابت ہونے لگے۔ وزیٹر (یا بہ الفاظ دیگر حکومت) علی گڑھ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہے، ایسا کیا تو ہندوستان بھر کے مسلمان برہم ہوجائیں گے۔ گرم دودھ سے زبان ایک بار جل گئی تو چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیا جارہا ہے۔ ایک بار حکومت کی نیت بگڑی تھی، اور وہ بھی اپنوں نے ہی بگڑوائی تھی۔ پندرہ سال تک یونیورسٹی کے اقلیتی کردار اور خود مختاری کی بازیابی کی جدوجہد جاری رہی جو اختتام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ 1981 کی شکل میں پہنچی۔ ہماری بدنصیبی کہ اس ایکٹ نے جہاں تاریخی کردار بحال کیا اور سلب کئے ہوئے اختیارات واپس دلائے وہیں اس میں کئی عنوان سے کجی آگئی۔ اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو اختیارات ملت کو اس ایکٹ کے ذریعہ ملے ان کا اس نے غلط استعمال کیا۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ ایکٹ میں، اس کے بنیادی مقصد کو محفوظ رکھتے ہوئے جہاں جہاں کجی آگئی ہے اسے ایوان میں لے جاکر درست کرنا چاہئے۔ مگر حکومت خائف ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی کوشش کی گئی تو مسلمان اسے مداخلت سمجھ کر اور حکومت کی بدنیتی پر محمول کرکے برافروختہ ہوجائیں گے۔ بہرکیف یونیورسٹی میں مسلمانوں کے نمائندوں کو جب شعور آئے گا تو وہ خود سرکار سے اس بے حد ضروری تصحیح کا مطالبہ کریں گے۔

الغرض یونیورسٹی ایک چیستاں کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے۔ حکومت سوچتی ہے کہ وہ اپنی انگلی کیوں جلائے۔ مسلمانوں کو اپنے پسینے میں کھولنے دو۔ کورٹ کو مسلمانوں کی بھرپور نمائندگی دی گئی ہے، اور اسے اعلیٰ ترین مجلس حاکمہ کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ مسلمان چاہیں گے تو یونیورسٹی کو آڑے وقت میں سنبھال لیں گے۔ اسے بھٹکنے نہ دیں گے، اس میں بدنظمی پھیلنے نہ دیں گے، اس کے معیار کو گرنے نہ دیں گے۔ لیکن ہوا کیا۔ اس تشویشناک دور میں جو گزر گیا، جس دور میں یونیورسٹی کا نظام، اس کا کردار، اس کی روایات چکنا چور ہوگئیں، نہ وزیٹر نے عنان کھینچی نہ ملت نے اپنے سب سے بڑے اثاثہ کو بچانے کی کوئی کوشش کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگر یونیورسٹی کو حقائق اور مسائل کا ادراک ہوتا تو مسلمانوں کے سارے بڑے بڑے مسئلوں پر وہ تحقیق کرچکی ہوتی اور اس کے نتائج کو وقت کے لحاظ سے آگے بڑھاتی رہتی۔ لیکن کوئی ایک ملکی یا ملی مسئلہ بھی ہے جس میں یونیورسٹی نے ریسرچ کو پایہ اعتبار تک پہنچایا ہو۔

۔ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ روایات ہیں، جذبہ ہے، وسائل ہیں لیکن ہم نے ان سب کو مفاد پرستوں کے ہاتھوں برباد ہونے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ ضرورت ہے ایک بیدار اور باشعور اور اخلاص پیشہ رائے عامہ کی۔

اسلام کی نظر میں عورتیں اثاثہ نہیں معاشرے کا ایک معزز حصہ ہیں

قرآن نہ صرف عورتوں کا طرفدار ہے بلکہ انکے پلڑے کو ہمیشہ بھاری رکھتا ہے

بے نظیر بھٹو کے قلم سے

ایک ایسے دور میں جب دنیا کے کسی ملک، کسی نظام اور کسی گروہ میں عورتوں کو کسی طرح کے حقوق حاصل نہیں تھے، ایسے معاشرے میں جہاں لڑکی کی پیدائش تک عذاب سمجھی جاتی تھی اور جہاں عورتوں کو اثاثہ تصور کیا جاتا تھا، اسلام نے انہیں معاشرے کے افراد کی حیثیت عطا کی۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری ہے "مومنین خواہ وہ عورت یا مرد آپس میں دوست ہیں۔ اوامر و نواہی کا اطلاق ان دونوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے"۔ (12،71)

صدیوں پہلے اسلام نے جو حقوق عورتوں کو دیئے آج جدید قومیں حاسدانہ جذبے کے تحت یا دباؤ میں آکر دینے پر رضامند ہوئی ہیں۔

قرآن چونکہ انسانی عظمت و حرمت پر خاص زور دیتا ہے اس لئے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ رنگ، نسل اور جنس کی بنیاد پر کسی امتیاز کی تفریق کی وکالت تو کجا اسے برداشت بھی کرے گا۔ مظلوموں کے تئیں قرآن کے حامیانہ رجحان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کئی اعتبارات سے عورتوں کا طرفدار ہے بلکہ ان کے پلڑے کو بھاری رکھتا ہے۔ انسانی حقوق کے زاویے سے دیکھئے تو قرآن کے نزدیک مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کسی فرد کی پرکھ کی واحد کسوٹی تقویٰ قرار دی گئی ہے جس کا مطلب ہے برے اعمال سے دور رہنا۔

سن شعور کو پہنچنے پر اسلامی شریعت کے تحت وہی حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں جو معاشرے کے ایک خود مختار فرد پر۔ وہ اپنے والدین کے ترکے میں سے حصے کی حقدار ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو اس کی شادی اس وقت تک کسی سے نہیں کرا سکتا جب تک کہ واضح طور پر اس کی مرضی شامل نہ ہو۔ شادی کے بعد مسلمان عورت کی انفرادی حیثیت ختم نہیں ہوجاتی۔ شوہر کے حقوق قانوناً اس کی بیوی کی ذات تک محدود رہتے ہیں، اس کی جائداد، جہیز یا اس کی آمدنی ان حقوق کے دائرہ کار میں نہیں آتے۔ عقد زواج عورت کے ایماء پر تحریر کیا جاتا ہے اور اگر وہ ضروری سمجھے تو ایسی شرائط کا اس میں اضافہ کرسکتی ہے جس سے اس کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہو اور ان شرائط کی پابندی شوہر پر قانوناً واجب ہوگی۔

اسلام طلاق کی بھی اجازت دیتا ہے اگرچہ وہ اسے ناپسندیدہ ترین اعمال میں شمار کرتا ہے۔ طلاق ہوجانے کی صورت میں شوہر کی طرف سے اسے جو کچھ ملا ہوتا ہے وہ برقرار رہتا ہے اس کے علاوہ نان نفقہ کے لئے بھی اس کا استحقاق ہوتا ہے۔ عورت خلع بھی لے سکتی ہے حالانکہ ایسی حالت میں اسے شوہر کی طرف سے ملی ہوئی مہر کی رقم سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

کثرت ازدواج قبائلی جنگوں میں مردوں کے کام آجانے کا قدرتی نتیجہ تھی جس کی بناء پر ہزاروں عورتیں بے سہارا ہوجاتی تھیں اور ان کی کفالت کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ اسی لئے بعض محدود شکلوں میں اسلام نے کثرت ازدواج کی اجازت دی۔ تاہم اس اجازت کے ساتھ بعض شرائط بھی لگادی گئیں مثلاً یہ کہ اگر ایک سے زائد بیویاں رکھ کر کوئی ان کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکتا تو اسے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے۔ بدکاری اور زنا جیسے جرائم میں ملوث پائے جانے والے مرد اور عورت کے لئے اسلام نے یکساں درجے کی سزائیں تجویز کی ہیں۔

اسی لئے عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں حقوق دیئے گئے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے چاہے اس کے لئے چین جانا پڑے۔"

اسلام کے ابتدائی دور میں جب مسلمانوں کو ہجرت کرنی پڑی تو بہت سی عورتیں گھروں سے نکل کر اکیلے مدینہ منورہ جانے والے راستے پر چل پڑیں۔ انہوں نے جنگوں میں بھی زخمیوں کی دیکھ بھال کی اور لڑائی میں بھی شریک ہوئیں۔ اسلام کی راہ میں پہلے شہید ہونے والوں میں سب سے پہلا نام ایک عورت کا ہی آتا ہے اور وہ تھیں سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اسلام کا حیات بخش پیغام اور مرد و زن کی روحانی مساوات پر اس کی تاکید اس وقت سے دھندلانے لگی جب سے مسلم معاشروں کا اخلاقی اور مادی زوال شروع ہوا۔ شہنشاہیت سے شخصی اقتدار تک کے جمہوری عمل اور قدیم تہذیبوں کے زیر اثر اقتدار پرستی کی مختلف شکلیں جن کا رخ اسلام نے موڑ دیا تھا پدری روایات کی تجدید کا سبب بنیں اور مردوں کی بالادستی کو مستحکم کیا۔ مسلم دنیا کے مختلف گوشوں میں آزادی کی جدوجہد میں بے شمار عورتیں گھروں سے باہر نکل آئیں۔ ہم اہل پاکستان نے اپنی آزادی کی جدوجہد میں سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ لیکن ایک عرصہ تک جمع ہوتے رہنے والے مسائل کا حل بذات خود آزادی میں نہیں تھا۔ اس حقیقت کا سب سے زیادہ اندازہ مسلمان عورت کو ہی ہوسکتا ہے جو ایسی قانونی موشگافیاں کرنے والے مفاد پرستوں کی تیار کردہ چوطرفہ دلدل سے خود کو نکالنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ فی الوقت تین مسلم ممالک کو عورتوں کی سربراہی حاصل ہے۔ میں اس یقین پر پہنچی ہوں کہ اسلامی معاشروں میں عورتوں کے مسائل کا سنجیدہ حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ خواتین رہنماؤں کی حیثیت سے ہم اسے اپنا مذہبی اور سیاسی فریضہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں عورتوں کی جس عظمت و وقار کی وضاحت آئی ہے اس کی بحالی کے لئے جدوجہد کریں۔ ہمیں اپنے مقاصد میں کامیابی نصیب ہو۔ (آمین)

"مسلم انقلابی موساد سے بھی زیادہ خطرناک ہیں"

مسلم انقلابیوں کو بدنام کرنے کے لئے مغرب کا گھناؤنا پروپیگنڈہ

اسلامی انقلابیوں کا وہ طبقہ جو بوجوہ مسلح جدوجہد میں یقین رکھتا ہے، مغرب کی نگاہوں میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا ہے۔ مغربی اہل قلم مختلف طریقوں سے ان انقلابیوں کو بدنام کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ خود اسلامی انقلاب کے تصور کو لوگوں کی نظروں میں ناپسندیدہ بنا دیا جائے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ اسرائیل کی ریاستی دہشت گردی کے خلاف سرگرم انقلابیوں کو اسرائیلی فوج اور موساد سے بھی زیادہ خوفناک شکل میں پیش کیا جائے۔ سازش یہ ہے کہ مسلم انقلابیوں کو ایک انتہائی منظم بین الاقوامی گروہ کے طور پر پیش کیا جائے جو امن عالم کے لئے ایک خطرہ ہے۔

بلاشبہ اسلامی انقلابی پوری دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ ویسے ہی دہشت گرد ہیں جیسا کہ اسرائیلی فوج یا اس کی خفیہ پولیس موساد، بالکل غلط ہے۔ حال ہی میں ایک مغربی صحافی نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھا کہ جس طرح موساد اور اسرائیلی فوج کے ہاتھ لمبے ہیں، اور جس طرح جب اور جہاں چاہیں وہ اپنے دشمن کو جالیتے ہیں ویسے ہی اسلامی مسلح جانبازوں کے ہاتھ بھی بڑے لمبے ہیں۔ اگر اسرائیل لبنان میں کسی گوریلا لیڈر کو قتل یا گرفتار کرتا ہے تو اسلامی انقلابی بیونس آئرس یا لندن میں یہودی ٹھکانوں پر حملے کردیتے ہیں۔ اسی طرح جب مصر کی ظالم پولیس و فوج اسلام پسندوں پر عرصہ حیات تنگ کردیتی ہے تو اسلامی جانباز عدیس ابابا میں حسنی مبارک پر قاتلانہ حملہ کردیتے ہیں۔ یہ اور ایسے ہی دوچار واقعات کو بنیاد بناکر اہل مغرب یا مسلم ممالک کا مغرب نواز طبقہ ایک عالمی اسلامی سازش اور منظم دہشت گردی کا ہوا کھڑا کرنے کی فکر میں ہے۔ خاص طور سے اسرائیلی حکومت اور وہاں کے دانشور اس نظریے کی حمایت میں سب سے آگے ہیں

> حال ہی میں ایک مغربی صحافی نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھا کہ جس طرح موساد اور اسرائیلی فوج کے ہاتھ لمبے ہیں، اور جس طرح جب اور جہاں چاہیں وہ اپنے دشمن کو جالیتے ہیں ویسے ہی اسلامی مسلح جانبازوں کے ہاتھ بھی بڑے لمبے ہیں۔

اسرائیل کا کہنا ہے کہ اسلامی انقلابی، چاہے وہ انفرادی حیثیت میں ہوں یا چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں وہ سب ایک نظریے سے بندھے ہوئے ہیں اور ایران اور سوڈان جیسے "بنیاد پرست" ممالک ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں تاکہ وہ ساری دنیا میں منظم انداز سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

اسرائیل کے بقول اس قسم کے انقلابیوں کا مرکز اگر کہیں ہوسکتا ہے تو وہ تہران ہے۔ اسرائیل کو دوسروں سے خاص طور سے یوروپی ممالک سے یہ شکایت بھی ہے کہ وہ امریکہ کے برعکس تہران پر زبردست معاشی و سیاسی دباؤ نہ ڈال کر اس کی مدد کر رہے ہیں۔

لیکن اسرائیل کے برخلاف مصر کا کہنا ہے کہ عالمی اسلامی انقلابیوں کے پیچھے سوڈان کا ہاتھ ہے۔ لیکن مصر اور اسرائیل دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ان دو ممالک کے خلاف سرگرم انقلابیوں کو مغربی ممالک ہی کے بعض افراد اور تنظیموں سے کافی مدد ملتی ہے۔ مالی مدد کے علاوہ ان ممالک میں انہیں اسلحے کے استعمال کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔

مصر کو شکایت ہے کہ قاہرہ کو مطلوب بعض انتہا پسند مغرب میں کھلے عام سرگرم عمل ہیں۔ مثلاً طلعت فواد قاسم جسے مصر کی الجماعت الاسلامیہ کا لیڈر تصور کیا جاتا ہے۔ اسے ڈنمارک میں سیاسی پناہ ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح انہیں شبہ ہے کہ الجہاد الجدید کا سربراہ ایمن زوحری جنیوا میں سکونت پذیر ہے۔ لیکن سوئزرلینڈ کے سفارت خانے کا کہنا ہے کہ اس کی پولیس کو اس آدمی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اس معاملے میں اسرائیل مصر سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ اس کا الزام ہے کہ خود امریکہ کے اندر ایسے بعض انقلابیوں کو تربیت دی گئی یا ان کے لئے پیسہ فراہم کیا گیا۔ محمد صلاح جس کا گھر شکاگو میں ہے، اور جو اس وقت پانچ سال کی سزا بھگت رہا ہے، دراصل حماس کی فوجی ونگ کے لئے یہاں پیسے اور ہتھیار جمع کرتا تھا۔ اسی طرح موسیٰ ابو مرزوق جو امریکہ میں دس سال سے زائد عرصہ سے رہ رہے ہیں، پر بھی اسرائیل کا یہ الزام ہے کہ وہ حماس کے حامی ہیں اور اس کی مالی مدد کرتے ہیں۔ اسرائیلی دباؤ کے تحت امریکہ نے مرزوق پر پابندی عائد کردی ہے۔ اسی طرح اسرائیل کا کہنا ہے کہ احمد بن یوسف حماس کے نظریاتی رہنما ہیں اور ورجینیا میں رہتے ہیں۔ اسرائیل نے ایک ویڈیو کیسٹ بھی تیار کیا ہے جس میں ایک فلسطینی کو یہ اعتراف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ 1990ء میں شکاگو میں ایک فوجی تربیتی کیمپ لگایا گیا تھا جہاں ایک لیبیائی ماہر نے انہیں کار میں بم لگا کر اسے اڑانے کی تدبیر بتائی تھی۔

لیکن اسرائیل اور مصر دونوں جس بات کو نظرانداز کردیتے ہیں وہ یہ کہ آخر کیوں انہیں دو ممالک کے خلاف انقلابی اسلام پسند زیادہ سرگرم ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان دونوں ہی ممالک میں عوام کو کھل کر اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کی اجازت نہیں ہے اور یہ کہ ان دونوں ہی ممالک میں ریاستی دہشت گردی اپنے شباب پر ہے۔ زیر حراست اموات میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ اکثر حکومت مخالف افراد کو ہمیشہ کے لئے راستہ سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کئی مغربی ممالک ایسے اسلامی انقلاب پسندوں کو ان سے نظریاتی اختلافات کے باوجود اپنے یہاں سیاسی پناہ دے دیتے ہیں۔

مراسلات

وزیراعظم کی خدمت میں ایک کشمیری کا کھلا خط

وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ نے یوم آزادی کے موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ جموں و کشمیر بھارت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ کوئی طاقت اس کو بھارت سے الگ نہیں کرسکتی۔ ان کا یہ اعلان سچائی پر مبنی نہیں ہے۔ انہوں نے ان تمام وعدوں اور معاہدوں کو نظرانداز کردیا جو حکومت ہند نے کشمیری عوام سے کئے تھے۔ ان کے پیش روؤں نے ریاست کو ایک متنازعہ علاقہ قرار دے کر تابع رائے شماری رکھا۔ وہ ایسے بیانات دے کر کروڑوں بھارت واسیوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ میں ان کی یادداشت کے لئے کچھ تاریخی ثبوت پیش کر رہا ہوں تاکہ وہ مسئلہ کشمیر کی اصل حقیقت کو سمجھ سکیں۔

27 اکتوبر 1947ء کو گورنر جنرل ہند نے مہاراجہ کو اپنے خط میں لکھا تھا۔

"حکومت ہند کی پالیسی کے مطابق جہاں کہیں بھی مسئلہ الحاق متنازعہ ہو ایسے الحاق کا فیصلہ اہل ریاست کی رائے کے مطابق ہونا چاہئے۔ ہماری حکومت کی رائے یہ ہے کہ ریاست میں حالات معمول پر آنے کے بعد رائے شماری سے الحاق کا فیصلہ کیا جائے گا"۔

ریاست میں فوجیں بھیجنے سے پہلے اسی خط میں گورنر جنرل یوں لکھتے ہیں۔ "بھارت کی فوج کشمیر میں آپ کی فوج کی مدد کے لئے بھیجی جارہی ہے تاکہ وہ آپ کے علاقے اور آپ کے لوگوں کی حفاظت کرسکے"۔

28 اکتوبر 1947ء کو وزیراعظم پنڈت نہرو نے برطانیہ کے وزیراعظم کو ایک تار میں لکھا تھا۔ "کہ نازک صورت حال میں کشمیر کی امداد کرنے سے یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ ہم ریاست کو ہند کے ساتھ الحاق کرنے کے لئے اثرانداز ہو رہے ہیں۔ متنازعہ الحاق کی صورت میں ریاست کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کریں گے۔ ہم اس رائے کے پابند ہیں"۔

1948ء میں جب بھارت نے مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں اٹھایا تھا تو وہاں پر بھارتی نمائندہ گوپال سوامی آینگر نے 6 فروری 1948 کو اپنی تقریر میں یوں کہا تھا کہ "ہم نے کشمیر کے الحاق کی پیشکش اس صورت میں قبول کیا جبکہ ریاست خطرے میں تھی۔ ہم ان حالات میں ریاست کو اس الحاق پر یہ کہہ کر پابند نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ الحاق کے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ حالات ٹھیک ہونے کے بعد کشمیری عوام رائے شماری سے فیصلہ کریں گے کہ وہ کیا چاہتے ہیں"۔

5 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے گوپال سوامی آینگر نے کہا تھا۔ "الحاق منظور کرنے کے وقت ہم نے نازک صورت حال سے فائدہ اٹھانے سے انکار کیا ہے۔ جس میں اس وقت ریاست مبتلا تھی ہم نے مہاراجہ کو واضح طور پر مطلع کیا کہ حالات بحال ہونے پر ریاست میں رائے شماری ہوگی"۔

مشہور قانون داں مسٹر متل داد نے 25 جنوری 1948ء کو سلامتی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "حکومت ہند نے اس بات کی پوری احتیاط کی ہے کہ وہ کشمیر کا الحاق اس شرط پر منظور کر رہی ہے کہ حالات معمول پر آنے کے بعد لوگوں کی رائے مناسب طریقے سے معلوم کی جائے۔ اور صرف اسی شرط پر حکومت ہند نے الحاق تسلیم کیا"۔

1948ء میں حکومت ہند نے کشمیر کے متعلق ایک وائٹ پیپر "ہند کے مقاصد" کے عنوان سے شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "کشمیر کے بھارت کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ متنازعہ الحاق کا فیصلہ رائے عامہ کے تابع ہوگا۔ اور اسی وجہ سے مہاراجہ کے الحاق کو عارضی بنیاد پر قبول کیا گیا۔

17 اکتوبر 1948ء کو پارلیمنٹ میں دفعہ 370 پیش کرتے ہوئے گوپال سوامی آینگر نے اپنی تقریر میں کہا تھا "حکومت ہند نے اپنے آپ کو پابند کیا ہے کہ ریاست کے عوام کو موقع دیا جائے گا۔ تاکہ وہ فیصلہ کرسکیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا اس سے الگ ہونا چاہتے ہیں لوگوں کی رائے عامہ سے معلوم کی جائے گی۔

جس اسمبلی کے الحاق کے متعلق وزیراعظم باتیں کرتے ہیں اس کے متعلق بھارتی نمائندہ سر بی۔ این راؤ نے سلامتی کونسل کو یہ یقین دلایا کہ کشمیر اسمبلی الحاق پر فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے اور نہ ہوگی۔ وہ صرف اپنی رائے دے سکتی ہے۔ اس کا اثر سلامتی کونسل کی قراردادوں پر نہیں ہوگا۔ یاد رہے کہ کشمیر اسمبلی کا وجود صرف ریاست کے لئے قوانین بنانے کے لئے تھا۔ اس کا الحاق پر کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے جس کی تصدیق خود وزیراعظم نہرو نے کی ہے۔

دفعہ 370 جو بھارتی آئین کا ایک حصہ ہے اور بھارت اور ریاست کے درمیان ایک آہنی پل کی حیثیت رکھتا ہے اس نے بھی ریاست کے الحاق کو عارضی قرار دیا ہے اس دفعہ نے مرکز کا حد اختیار صرف دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل تک ہی محدود کردیا ہے۔ باقی معاملات میں ریاست کی اندرونی خود مختاری تسلیم کی۔ اس دفعہ کے پارٹ 11 XX میں صاف طور پر ان لفظوں سے الحاق کے متعلق وضاحت کی گئی ہے کہ الحاق مستقل نہیں عارضی ہے مشروط ہے غیر مشروط نہیں۔ اس دفعہ نے پارلیمنٹ کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ دفعہ 370 کی ترمیم کردے۔ جب یہ ثبوت ہو تو پھر کس طرح ریاست بھارت کا اٹوٹ حصہ ہوسکتا ہے۔

1953ء کے بعد مرکزی حکومت نے کشمیر میں جو کچھ کیا وہ آئینی تھا؟ آئین ہند کی بے حرمتی آپ نے کی، الزام کشمیریوں پر۔ دفعہ 356، 357 لوگوں کی مرضی کے بغیر ریاست پر نافذ کیا گیا ٹاڈا ایکٹ نافذ کردیا گیا کیا یہ غیر آئینی نہیں تھا؟ کیا مرکزی قوانین ریاست پر نافذ کرانے کا حق پارلیمنٹ کو ہے دفعہ 370 نے یہ حق بھی پارلیمنٹ سے پہلے چھین لیا ہے۔ وزیراعظم دفعہ 370 کا بغور مطالعہ کریں صداقت سامنے آجائے گی۔ فوجی طاقت سے اب تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے نہ ہوگا۔ بے بنیاد بیانات دے کر مسئلہ کشمیر کی اصل حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

غلام رسول۔ سری نگر

حیدرآباد میں ارون شوری کی نازیبا حرکت

گذشتہ دنوں حیدرآباد کے ودیا بھون میں " دفعہ 44 یونیفارم سول کوڈ کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ارون شوری نے مسلمانوں اور پرسنل لا کے خلاف نازیبا انداز تخاطب اختیار کیا اور علماء و قائدین کو چیلنج کیا۔ اس پر سامعین میں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ برقعہ پوش خواتین اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور بہ آواز بلند ارون شوری کے چیلنج کو قبول کیا۔ ارون شوری نے جواب دینے سے گریز کیا۔ اور کئی مرتبہ سنی ان سنی کردی۔ اس موقع پر ارون شوری نے انتہائی نازیبا اور غیر مہذب رویہ اختیار کیا۔

مسلم پرسنل لا کی مخالفت میں ارون شوری کی اتنی گہری اور ذاتی دلچسپی سے دشمنان اسلام کے عزائم اور سازشوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ شہر کی فضا مکدر ہے اور فساد ہوچکا ہے اکثریت کو مشتعل کرنا اور اقلیت کی دل آزاری کرنا سیکولرزم کے منافی ہے۔

خواتین کی گفتگو کے دوران سامعین میں سے ایک مسلم نوجوان اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا ارون شوری کے پاس اسٹیج کے قریب پہنچ گیا اور ارون شوری سے نازیبا الفاظ کو واپس لینے پر اصرار کیا۔ جس پر منتظمین کا بڑا حصہ نوجوان اور خواتین پر ٹوٹ پڑا۔ پولیس کی مدد سے انہیں باہر نکالنے کی کوشش کی گئی۔ برقعہ پوش خواتین نے ہال سے باہر جانے سے انکار کردیا۔ جس پر ان خواتین کا گھیراؤ کیا گیا۔ اور ان کی تضحیک کی گئی۔ اس کی مذمت میں خواتین کی ایک کل جماعتی تحفظ شریعت کمیٹی کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں شوری اور دوسرے لوگوں کے رویہ کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا اور ان کی گفتگوؤں کو ذہنی و فکری دیوالیہ پن قرار دیا۔ اور ارون شوری کو ہندو دہشت پسند تنظیموں کا نمائندہ قرار دیا گیا۔

ذکیہ بیگم
کنوینر کل جماعتی تحفظ شریعت کمیٹی
حیدرآباد

سورج منڈل کے خیالات اور مسلمان

گذشتہ دنوں انجمن اسلامیہ رانچی کی جانب سے جھارکھنڈ کے لیڈروں کو استقبالیہ دیا گیا جس میں سب سے پہلے ڈپٹی چیرمین جناب سورج منڈل نے عوام سے خطاب کیا اور پیش کئے گئے میمورنڈم کے اہم نکات پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم جھارکھنڈ علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتیں گے اور ان کے جائز حقوق اور مطالبات پر نہایت ہی سنجیدگی سے غور کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ جھارکھنڈ میں اردو کو وہی درجہ حاصل ہوگا جو بہار میں ہے۔ البتہ سورج منڈل نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں یہ بھی کہا کہ میں نہیں جانتا کہ بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کیا ہوتا ہے لیکن اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ ان کے درمیان کافی جھگڑے ہیں۔ اس لئے آپ پہلے اپنے جھگڑے طے کرلیجئے اور صرف مسلمان بن کر ہمارے سامنے آئیے۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمان ایک محروم طبقہ ہے اور ہم ہر اس طبقے کے ساتھ ہیں جو محرومیت کا شکار ہے۔

جھارکھنڈ کونسل کے صدر جناب شیبو سورین نے کہا کہ ہماری پہلی ترجیح جھارکھنڈ علاقے سے فرقہ پرستی کا خاتمہ ہوگی ہم قطعاً برداشت نہیں کریں گے کہ کوئی فرد یا جماعت آدیباسیوں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کی بیج بوئے۔ ہم مسلمانوں کے جائز حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور اختیارات کی منتقلی کے بعد اس پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

شریف احسن مظہری
آفس انچارج مجلس علماء چھوٹا ناگپور۔ رانچی

انعامی مقابلہ

موضوع:۔ "معاشرہ کی تعمیر میں طلبا کا کردار"

زبان:۔ اردو، ہندی یا انگریزی

الفاظ:۔ تقریباً ایک ہزار

تاریخ:۔ موصول ہونے کی آخری تاریخ 25 دسمبر

انعامات:۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے امیدواروں کو علی الترتیب 250۔ 151 اور 101 روپئے کے انعامات و سند اور 4 سے 20 نمبر تک آنے والے امیدواروں کو شمولیت کی اسناد دی جائیں گی۔ شمیم اختر۔ قومی اتحاد کمیٹی پڑریا۔ پوسٹ۔ دھمول۔ ضلع۔ نوادہ۔ 805101 (بہار)

کیا بچوں کا بٹوارہ ہوسکتا ہے۔

موقر جریدہ "ملی ٹائمز" 16 تا 30 ستمبر 1995ء کا صفحہ 3 پر مقالہ بعنوان "بچوں کو ماؤں کی گود سے چھین جھپٹ کر فروخت کردیا جاتا ہے"۔ پڑھتے ہی میرے دل کے تار جھنجھنا اٹھے ہیں۔ میں مسلمانان عالم سے عموماً اور مفتیان عرب و عجم سے خصوصاً یہ پوچھنے کی جرات کرنا چاہتا ہوں کہ "یہ ہمارا ظالم سماج روتی، بلکتی، تڑپتی اور سسکتی ممتا بھری مطلقہ ماؤں کی گود سے چھین جھپٹ کر بچہ ان کے باپوں کے حوالہ کردیتا ہے تو آخر وہ بچہ کس کا ہے؟"

احکم الحاکمین کا کھلا فیصلہ تو یہی ہے کہ بچہ درحقیقت ماں باپ دونوں ہی کا ہے اور ان دونوں کے ساتھ احسان کرنا اس کا دینی فریضہ ہے۔ لیکن جب وہ بچہ مفتیوں کے من مانے فیصلہ کے مطابق اس کے باپ کے حوالے کردیا جاتا ہے تو وہ اپنی ماں کے ساتھ کیونکر احسان کرپائے گا؟ گویا اللہ کا حکم یک قلم بے اثر و بیکار ہوگیا۔ وہ بچہ اپنی ماں کی وراثت کا جائز حقدار کیوں کر ہوگا؟ اس کی ماں کا ترکہ اسے کہاں ملے گا؟ اس کے لئے ملاؤں کے پاس ایک یہی وظیفہ رٹنے کے لئے رہ گیا ہے کہ "ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔"

حاصل کلام یہ کہ قرآن حکیم کی رو سے بچہ اپنے ماں باپ کی مشترکہ جائداد (جوئنٹ پراپرٹی) ہے جس کا بٹوارہ ہرگز ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔

مظفر حسین (خطیب مسجد)
بازار۔ حاجی گلی مدھوپور (دیوگھر)

پرسنل لا بورڈ کو ایک مشورہ

احمد آباد میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس کے انعقاد کے پیش نظر آپ کے اخبار کے توسط سے ایک مشورہ دینے کی جرات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس بار بورڈ صرف ایک نکاتی فیصلہ پاس کرے اور وہ یہ ہو کہ "اب تک جتنی قراردادیں اور مطالبات منظور کئے گئے ہیں، ان پر عمل کیا جائے۔" اگر یہی ایک فیصلہ بورڈ کرلے تو اس کی بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ اگر ایسا کرنا مشکل ہو تو پھر اس عہد پر اجلاس کا اختتام عمل میں آئے کہ "ہم کچھ بھی نہیں کریں گے۔ کرنے کے نام پر نشستند، گفتند، خوردند و برخاستند کی روایت کو زندہ رکھنے کا کارنامہ انجام دیں گے کہ یہی ہمارا منصب ہے۔"

عنایت زاہدی ایم اے
شاستری پارک۔ دہلی 62

ملی ٹائمز ہندی میں بھی ہو

میں ملی ٹائمز کافی دنوں سے پڑھتا آرہا ہوں۔ یہ ایک بہت ہی معتبر اور معیاری اخبار ہے۔ مجھے امید ہے کہ قوم اس سے فائدہ حاصل کرے گی اس ناچیز کا ایک مشورہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ اگر ممکن ہو تو اس کا ہندی ایڈیشن بھی نکالا جائے کیونکہ اس سے دوسری قوم بھی اسلام سے متعارف ہوگی اس ملک کے مسلمانوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

ذکی حسن۔ پٹنہ (بہار)

دل بھر آیا

ملی ٹائمز 16 تا 30 ستمبر 1995ء ملا۔ پڑھ کر دل بھر آیا۔ آخری صفحہ کا مضمون "اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے" نے دل کی گہرائی کو چھولیا۔ درحقیقت یہ ہر باشعور مومن کی دعا ہے۔

موجودہ بے حس علماء قوم کو تھپکی دے کر سلا رہے ہیں۔ امت کو ہزار خانوں میں بانٹ کر اپنی دھاک جمائے بیٹھے ہیں۔ بقول اقبال

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

افسوس! آج ملت اسلامیہ کو علماء کی ساحری تھپکی دیتی نظر آتی ہے۔ آپ کی جرات مندی قابل تعریف ہے کہ اس ملک میں ملت اور اسلام کی آواز کو بلند کر رہے ہیں۔ بوسنیا کے دینی بھائیوں کے لئے ایک پرائیویٹ سکٹر سے جو تعاون و امداد ہوتی ہے وہ رہتی دنیا تک ملت اسلامیہ پر ایک عظیم احسان ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ جلد پوری دنیا اللہ کے دین کے ماتحت ہوجائے اور کافرین، مشرکین، فاسق، فاجر اور منافق سے زمین خالی ہوجائے۔ میری دلی خواہش ہے کہ ہماری زندگی دو دن کی ہو لیکن مثل ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے۔ ہم صرف اللہ کے لئے جئیں اور اللہ کے لئے مریں۔

افضل حسین۔ اربا۔ رانچی

ہندوستان میں ہماری ایجنسیاں

☆ آزاد بک ڈپو
جنگی مسجد۔ بیتیا (بہار)

☆ محمد مجیب الرحمن صاحب
کمہروا، جھاداری، پورنیہ (بہار)

☆ آزاد بک اسٹور
مین روڈ، مدھوبنی (بہار)

☆ مولوی مطلوب حسین
چوک بازار۔ سہسرام (بہار)

☆ محمد غلام مصطفی
کتاب ایجنسی۔ نیر چاند سنیما۔ گاندھی میدان روڈ۔ بہار شریف۔ نالندہ (بہار)

☆ قریشی نیوز ایجنسی
جی بی ایچ مین روڈ۔ راورکیلا

☆ جانکی پرساد یادو
موروا۔ جمال پور۔ مونگیر (بہار)

اعلان

ماہ نومبر سے ملی ٹائمز انٹرنیشنل کی قیمت پانچ روپے ہوگی (ادارہ)

" تمہارے خوابوں کا شہزادہ کون ہے۔ کیا اپنے باس سے معاشقہ ایک اچھا خیال ہے؟ "

مغربی تہذیب کے زیر اثر روسی معاشرے پر جنسی رسائل کی یلغار

کمیونزم کے پنجے سے نکلنے کے بعد روسی سماج تیزی سے مغربی تہذیب، خصوصاً اس کے ان پہلوؤں سے متاثر ہورہا ہے جو مرد و زن کے تعلقات سے متعلق ہیں اور جو مشرقی معیار کے مطابق شرم و حیا کی تمام سرحدیں پھلانگ چکے ہیں۔ روس کے بے شمار اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں اور سوالات عام ہوگئے ہیں۔ تمہارے خوابوں کا شہزادہ کون ہے الین ڈیلن، بل کلنٹن یا کوئی اور؟ کیا اپنے باس سے معاشقہ ایک اچھا خیال ہے؟ لوگ تمہیں ٹوٹ کے چاہیں اور اس کے بعد بھی تم ان کی گرفت میں نہ آؤ تو یہ تمہارے کیریئر کے لئے مفید ہے۔ تم تیزی سے ترقی کی سیڑھیاں طے کروگی۔ تم روسی مردوں کی کنڈوم استعمال نہ کرنے کی عادت کا مقابلہ کیسے کرتی ہو؟ مرد اس وقت محبت کرتا ہے جب تم اس کی تعریف کرو۔ اس لئے تم اس کے تئیں اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار خوب کرو، خاص طور سے جب اسے کنڈوم پہننے کے لئے دو۔ وغیرہ وغیرہ۔

اوپر درج کئے گئے سوالات، ان کے جوابات اور عورتوں کے لئے دیگر مشوروں سے آج کل بہت سے روسی رسائل بھرے رہتے ہیں۔ کمیونسٹ دور میں اس قسم کے سوالات و مشوروں سے خواتین میگزین خالی ہوتی تھیں۔ لیکن کمیونزم کے خاتمے کے بعد جب روس نے مغرب کی نقالی شروع کردی تو گویا مغربی تہذیب نے یلغار سی کردی۔ "کاسمو پولیٹن" اور "گوڈ ہاؤس کیپنگ" جیسی میگزین روسی زبان میں بھی نکلنے لگیں۔ کھلے بازار میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے روس کے پرانے خواتین رسائل بھی مغربی انداز کی بے حیائی کی دوڑ میں شامل ہوگئے۔ لیکن پھر بھی یہ "کاسمو پولیٹن" کا مقابلہ نہیں کر پارہے ہیں۔ "کاسمو پولیٹن" کا روسی ایڈیشن اپریل 1994ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس وقت اس کی اشاعت صرف 60 ہزار تھی جو اب بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہوگئی ہے اور ساڑھے چار ڈالر کی بھاری قیمت کے باوجود اس کی ہر کاپی فروخت ہوجاتی ہے۔

> "کاسمو پولیٹن" کا روسی ایڈیشن اپریل 1994ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس وقت اس کی اشاعت صرف 60 ہزار تھی جو اب بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہوگئی ہے اور ساڑھے چار ڈالر کی بھاری قیمت کے باوجود اس کی ہر کاپی فروخت ہوجاتی ہے۔

"کاسمو پولیٹن" روسی مردوں اور عورتوں کے لئے اپنے اندر بہت کچھ رکھتا ہے۔ حال ہی میں اس نے ایک سروے کی رپورٹ شائع کی تھی جس سے پتہ چلا کہ 55 فیصد عورتیں اپنے پارٹنرز سے دھوکہ کرتی ہیں اور بیس اور تیس سال کے درمیانی عمر کی دس فیصد خواتین 26 سے زائد مردوں سے جنسی تعلقات رکھتی ہیں۔

"کاسمو پولیٹن" کا خیال ہے کہ جنسی معاملات میں روسی عورتیں کافی ہوشیار ہیں۔ مسئلہ مردوں کے ساتھ ہے۔ ان کی جنسی تعلیم بہت ناقص ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان مغربی رسائل کے روسی ایڈیشنوں میں عورتوں کو یہ مشورے بھی دئے جاتے ہیں کہ بہتر خاندانی زندگی کی خاطر مردوں کی مردانگی کا خیال رکھنا چاہئے۔ کام کرنے والی خواتین کو خاص طور سے بہتر خانگی زندگی کے لئے مشورے دئے جاتے ہیں۔

بعض روسی خواتین کا کہنا ہے کہ ان رسائل کی مختلف کہانیوں کو پڑھ کر یا ان کے مشوروں پر عمل کرنے سے انہیں فائدہ ہوا ہے۔ مثلاً سینٹ پیٹرس برگ کی ایک خاتون اولگا کا کہنا ہے کہ حال ہی میں اس کے شوہر کو ایک باہر کی کمپنی میں نوکری مل گئی جس کے بعد وہ زیادہ تر وقت زیادہ نوخیز لڑکیوں کے ساتھ گزارنے لگا۔ مغربی رسائل کے بعض اسباق اور مشوروں نے اس کی مدد کی۔ اس نے پریشانی کا اظہار کرنے اور کوئی عاجلانہ قدم اٹھانے کے بجائے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا اور بتدریج اپنے شوہر کو دوبارہ فتح کرنا شروع کیا۔ اولگا کا کہنا ہے کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب رہی ہے۔ شاید اولگا نے کچن میں اپنا وقت زیادہ صرف کرنا شروع کردیا ہے۔

بقیہ اپنوں کے ہاتھوں سرزمین افغانستان لہولہان

بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ کابل حکومت کے علاوہ ایسے بے شمار افراد افغانستان کے باہر اور اندر بھی پائے جاتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ طالبان کو دراصل حکومت پاکستان یا کم از کم آئی ایس آئی کی حمایت حاصل ہے۔ لیکن کیا بے نظیر جیسی سیکولر خاتون ایسے شدت پسند مذہبی لوگوں کی حمایت واقعی کرسکتی ہیں، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔

سچ یہ ہے کہ ربانی حکومت اور بے نظیر حکومت دونوں کے ظاہری دعوے کھوکھلے ہیں۔ ربانی کا یہ مطالبہ کہ پاکستان افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت بند کردے غیر عملی ہے۔ لاکھوں افغانی آج بھی پاکستان میں پناہ گزیں ہیں اس لئے اسلام آباد اگر چاہے بھی تو افغانستان کے اندرونی معاملات سے غیر متعلق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ افغانستان میں جو کچھ ہورہا ہے اس کا براہ راست اثر پاکستان پر پڑے گا۔ اسی طرح افغانستان کے معاملات میں بے نظیر حکومت کا عدم مداخلت کا دعوی کوئی وزن نہیں رکھتا۔ خواہی نہ خواہی اسلام آباد کو افغانستان کے معاملات میں دلچسپی لینی ہی پڑے گی۔ سچ یہ ہے کہ اسلام آباد کے پالیسی سازوں میں ایک طاقتور طبقہ اس نظریے میں یقین رکھتا ہے کہ ربانی حکومت پر فوج اور بیوروکریسی میں موجود سابق کمیونسٹوں کا اثر بہت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے موجودہ کابل حکومت پاکستان مخالف رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس روس اور ہندوستان سے اس کے تعلقات استوار ہوئے ہیں۔ حال ہی میں طالبان نے روس کے ایک مال بردار جہاز کو بہ طاقت اپنے اڈے پر اتار کر یہ ثابت بھی کردیا ہے کہ ربانی کو روس کی حمایت حاصل ہے کیونکہ یہ جہاز ہتھیار لے کر کابل جارہا تھا۔ ایسے حالات میں ربانی کی یہ توقع کہ پاکستان افغانستان کے معاملات میں مداخلت نہ کرے گا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ بے نظیر کے پاس شدت پسند مذہبی طالبان کی حمایت کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے کیونکہ اس وقت افغانستان میں ربانی حکومت کا یہی گروہ مقابلہ کرسکتا ہے۔

طالبان کی چند ماہ قبل کی زبردست شکست کے بعد اتنی جلد کابل کے دروازے پر دوبارہ دستک دینے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہیں پاکستان کی حمایت حاصل ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا طالبان اس وقت میدان شہر میں کابل پر حملے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ اس سے کابل میں موجود نام نہاد سیکولرسٹوں کو کافی پریشانی لاحق ہوگئی ہے۔ طالبان کی اسلامی شریعت نافذ کرنے کی پالیسی کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ایک مغرب زدہ دانشور نے جھلاہٹ کے ساتھ کہا کہ "وہ ہمیں گدھوں کی دم سے باندھ کر ملک کو سات سو سال پیچھے لے جائیں گے۔"

کابل حکومت کے مراعات یافتہ افسران بھی پریشان ہیں خاص طور سے وہ لوگ جو سابق کمیونسٹ حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ ایسے ہی ایک افسر نے غصے سے کہا کہ "طالبان کا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ وہ صرف مذہبی جنونی ہیں۔" مگر خود طالبان کا کہنا ہے کہ وہ صرف قرآن اور احادیث رسول صلعم کی اتباع کرتے ہیں۔

بہرکیف اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کابل حکومت افغانستان میں یکہ و تنہا ہوکر رہ گئی ہے۔ حکمت یار رشید دوستم، مجددی اور حزب وحدت وغیرہ نے ایک متحدہ محاذ بنالیا ہے۔ یہ لوگ بھی کابل حکومت کے سخت مخالف ہیں۔ اگر یہ نیا اتحاد کسی قسم کا طالبان سے معاہدہ کرلے تو کابل کا سقوط یقینی ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو محض طالبان ہی اس وقت کابل کے لئے زبردست خطرہ ہیں۔ اسی چیز کو محسوس کرتے ہوئے یا اس امید میں کہ کابل کسی وقت بھی طالبان کے قبضہ میں آسکتا ہے۔ دنیا بھر کے صحافی اور نامہ نگار محاذ سے رپورٹنگ کے لئے افغان دارالحکومت پہنچ گئے ہیں۔

بقیہ انتخابات سے قبل جوتوں میں دال بٹنے لگی

ان کے مخالفین میں گروپ بازی تیز ہورہی ہے۔ جو عنقریب کھل کر سامنے آسکتی ہے۔ مرکزی سطح پر آڈوانی اور جوشی کے الگ الگ گروپ ہیں۔ جوشی کو اس وقت بالکل الگ تھلگ کردیا گیا ہے اور آڈوانی حاوی ہیں۔ مجموعی طور پر پوری بی جے پی آج کل اکھاڑہ بنی ہوئی ہے اور لوگ لڑنے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ ابھی تو یہ مرکزی اقتدار تک پہنچے بھی نہیں ہیں اور یہ حالت ہوگئی ہے۔ سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ اس صورت حال سے بی جے پی کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ عوام کے سامنے اس کی صاف ستھری امیج کی قلعی کھل گئی ہے اور پارلیمانی انتخابات تک آپسی چپقلش میں مزید اضافہ ہوگا۔

ٹکٹوں کی تقسیم میں بھی زوردار دنگل ہوگا اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بی جے پی آپسی رسہ کشی کا شکار ہوکر اپنی ساری توانائی ضائع کردے اور دلی پر قبضہ کرنے کا اس کا خواب ملیامیٹ ہوجائے۔

فلسطین اسرائیل معاہدہ ایک مغربی کارٹونسٹ کی نظر میں

زیادہ مت مانگنا بس ذرا سا دوں گا ——— بال

وہ ایک طرف ٹھاکرے کا خاکہ اڑاتا ہے اور دوسری طرف مسلم انتہا پسندی سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا ہے

رشدی کی ذہنی کیفیت بتاتی ہے کہ وہ جلد ہی پاگل ہو جائے گا

آج سے تقریباً سات سال پہلے شیطان رشدی نے اسلام سے اپنی نام نہاد وابستگی کی آڑ لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اپنے ناول "شیطانی آیات" میں فنکاری اور ادبی اسلوب کے نام پر گستاخی کرکے پوری دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ اس کی ہرزہ سرائی پر مسلمانوں کے رد عمل کو پوری دنیا میں بنیاد پرستی سے موسوم اور آزادی تحریر پر حملے سے تعبیر کیا گیا تھا اور پوری مغربی دنیا کو خود کو بنیاد پرستی کی گرفت میں آجانے کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا۔ اسی سلمان رشدی نے حال ہی میں اپنی تازہ ترین تصنیف "دی مورس لاسٹ سائی" میں ہندوستانی نژاد ہونے کی حیثیت سے تقسیم ملک کے بعد کے حالات سے اپنے تعلق خاطر کے اظہار کے بہانے بعض گذشتہ اور موجودہ سیاسی شخصیتوں کو ہدف تنقید بناکر مغرب کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان تو بنیاد پرست ہیں ہی لیکن ہندو بھی کچھ کم جنونی نہیں ہیں۔

رشدی کے گذشتہ ناشر وائکنگ پنگوئن نے اب اس کی کتابوں کی اشاعت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ کیونکہ "شیطانی آیات" کے منظر عام پر آنے کے بعد رونما ہونے والے پرتشدد واقعات کو دیکھتے ہوئے کمپنی کو اپنے ملازمین کے لئے حفاظتی انتظامات کرنے پر کافی زیر بار ہونا پڑا اور رشدی کو جان سے مار دینے کے ایرانی فتوے نے اس کے اعزا و اقارب اور حلقہ بگوشوں سب کو اس سے دور کردیا۔ ناول کے لئے رشدی نے ایک دوسرے مہم جو ناشر جوناتھن کیکاس کی خدمات حاصل کی ہیں اور ہندوستان میں اس کی تقسیم کار روپا اینڈ کمپنی ہے جس نے بمبئی میں اس کتاب کی فروخت کو روک کر اپنے اس اقدام کو رضاکارانہ پابندی کے نام سے مشتہر کیا ہے۔ شیطانی آیات کی فروخت پر پابندی لگنے کے باوجود پنگوئن کے کاؤنٹر سے اس کے بکنے اور "دی مورس لاسٹ سائی" پر سرکاری پابندی عائد نہ ہونے کے باوجود اس کی تقسیم روک دئے جانے میں زبردست تضاد ہے۔ اول الذکر مسلمانوں کی طرف سے کسی اشتعال انگیزی کے بغیر بے تکلفی اور بے شرمی سے شیطانی آیات کی کاپیاں فروخت کرتا ہے اور مسلمانوں کو غم و غصہ کی آگ میں جلاتا ہے اور دوسرا ادارہ تشدد بھڑکنے اور اس سے متاثر ہونے کے خوف سے، اس کی آگ میں جلنے کے ڈر سے ایک کتاب کو بازار میں لانے سے باز رہتا ہے۔ اشاعتی اداروں کے متضاد رویوں سے جو پیغام ملتا ہے وہ یہاں وضاحت کا محتاج نہیں۔

شیطان رشدی اپنی نئی کتاب کے ساتھ

کہا جاتا ہے کہ نئے ناول "دی مورس لاسٹ سائی" میں رشدی نے ہندوستان میں جمہوریت کے مستقبل کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور بعض لوگوں کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ خاصا متنازعہ ہے۔ مثلاً شیو سینا کے چیف بال ٹھاکرے کا تمسخرانہ خاکہ اور ایک کتے کو جواہر لال کا نام دینا۔

> نئے ناول "دی مورس لاسٹ سائی" میں رشدی نے ہندوستان میں جمہوریت کے مستقبل کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور بعض لوگوں کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ خاصہ متنازعہ ہے۔ مثلاً شیو سینا کے چیف بال ٹھاکرے کا تمسخرانہ خاکہ اور ایک کتے کو جواہر لال کا نام دینا۔

واضح رہے کہ روپا اینڈ کمپنی نے جب اس کتاب کی تقسیم بمبئی میں روک دی اور کہا کہ اس میں بال ٹھاکرے کا مضحکہ اڑایا گیا ہے تو شیو سینا نے اس کتاب کے خلاف زبردست زہر افشانی کی۔ بال ٹھاکرے نے کہا کہ انہوں نے یہ کتاب پڑھی نہیں ہے لیکن اگر اس میں میرا مذاق اڑایا گیا ہے تو میں اس پر پابندی عائد کردوں گا۔ وزیر اعلیٰ منوہر جوشی نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ کتاب میں بال ٹھاکرے کو ان کے پیشے کے اعتبار سے کارٹونسٹ دکھایا گیا ہے لیکن ذرا مضحکہ خیز انداز میں۔ اس پر بال ٹھاکرے کا بیٹا بھی بول پڑا اور اس نے کہا کہ کارٹونسٹ اور ناول نگار میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ ایک ناول نگار کو ایک کارٹونسٹ کا مذاق اڑانے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ شیو سینا کی جانب سے جس رد عمل کا اظہار کیا گیا اس سے اندازہ لگایا گیا کہ اگر یہ کتاب بمبئی میں فروخت ہوئی تو اس پر زبردست ہنگامہ ہوگا۔ یہ کتنی متضاد اور مضحکہ خیز بات ہے کہ جب مسلمانوں کی دلآزاری ہو تو اظہار خیال کی آزادی کے نام پر اس پر پابندی لگانے کے عمل کی مذمت کی جائے لیکن جب خود انہی لوگوں کی دلآزاری ہو تو اس کے خلاف واویلا مچاکر اس پر پابندی لگانے کی بات کی جائے۔

> یہ کتنی متضاد اور مضحکہ خیز بات ہے کہ جب مسلمانوں کی دل آزاری ہو تو اظہار خیال کی آزادی کے نام پر اس پر پابندی لگانے کے عمل کی مذمت کی جائے لیکن جب خود انہی لوگوں کی دل آزاری ہو تو اس کے خلاف واویلا مچاکر اس پر پابندی لگانے کی بات کی جائے۔

رشدی نے ایک معروف جریدے کے ایڈیٹر کو انٹرویو کے دوران اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ہرچند کہ یہ ناول ہندوستانی پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس کا مقصد نہرو کے تعمیر کردہ ہندوستان کا مذاق اڑانا نہیں بلکہ درحقیقت اس نقصان پر اظہار افسوس کرنا ہے جو آزادی کے بعد سے اب تک ہندوستانیت کے تصور کو پہنچتا رہا ہے۔ جہاں تک کتے کے نام کا تعلق ہے تو ناول میں واحد وطن دشمن اور انگریز پرست کردار اس کا مالک ہے جس نے وطن پرستوں کی تضحیک کی غرض سے اس کتے کا نام جواہر لال رکھا ہے۔

انٹرویو میں دئے گئے بیانات سے رشدی کی متضاد ذہنی کیفیتوں کی عکاسی ہوتی ہے گویا کہ ہر آن لڑھکتے رہنا اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ شیو سینا کا خاکہ اڑانے کے جواز میں تو یہ کہتا ہے کہ یہ پارٹی ملک کی سیاست کو جس رخ پر لے جانے کی کوشش کر رہی ہے وہ ملک کے لئے کچھ سودمند ثابت نہیں ہوگی۔ دوسری طرف وہ سنسر شپ کی گرفت میں جمہوریت کی نبض سست پڑتی ہوئی محسوس کرتا ہے اور مسلمانوں اور سکھوں کی طرف سے اس قوم کو لاحق مذہبی انتہا پسندی کے خطرات

بقیہ صفحہ ۱۸ پر

بنگلہ دیش سے متعلق پاکستانی قلمکار حسن ظہیر کی کتاب ہندوستان میں ضبط

ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو دن رات آزادی اظہار خیال کے حوالے سے اسلام اور مسلمانوں کو طنز و تنقید کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ لیکن خود حکومت ہند اظہار خیال کی آزادی کے تمام دعوؤں کے باوجود اکثر ایسے اقدامات کرتی رہتی ہے جو دستور میں دئے گئے اس بنیادی حق کے خلاف ہوتے ہیں۔ لیکن اظہار خیال کی آزادی کے نام نہاد چیمپئن ایسے مواقع پر کہیں سوجاتے ہیں۔ یہ لوگ صرف اس وقت واویلا مچاتے ہیں جب حکومت مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے والی کسی کتاب پر پابندی لگاتی ہے۔

ہندوستان میں کسی کتاب پر پابندی لگانا بہت آسان ہے۔ یہ کام ائر پورٹ پر بیٹھا ہوا کوئی کسٹم آفیسر بھی کرسکتا ہے۔ وزارت داخلہ، خارجہ یا کسی دوسرے شعبے کی طرف سے اسے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسٹم آفیسرز ان اختیارات کا اکثر غلط استعمال کرتے ہیں۔ اگست میں پولا نیوبرگ کی کتاب، جو مسئلہ کشمیر سے متعلق ہے، ضبط کرلی گئی تھی۔ لیکن اس سے بھی قبل گذشتہ سال اکتوبر میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے چھپی ہوئی پاکستانی صاحب قلم حسن ظہیر کی کتاب "مشرقی پاکستان کی علیحدگی" ضبط کی گئی تھی اور ناشرین کے بار بار اصرار کے باوجود یہ بتانے کی زحمت نہیں کی گئی کہ کتاب کو کن اسباب کی بنا پر ضبط کیا گیا ہے۔

> حسن ظہیر کی کتاب ایک علمی کاوش ہے جس میں انہوں نے بنگالی قومیت کے عروج، مشرقی و مغربی پاکستان کے کشیدہ تعلقات اور سابق مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی زیادتیوں وغیرہ پر کھل کر روشنی ڈالی ہے۔ جنوبی ایشیا کا ہر طالب علم اس کتاب کو تاریخی اہمیت کا حامل پائے گا۔

حسن ظہیر بنگلہ دیش کی آزادی کے وقت ڈھاکہ میں ایک سینئر پاکستانی آفیسر تھے۔ دسمبر 1971ء میں پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انہیں گرفتار کرلیا گیا تھا۔ وہ جنوری 1974ء تک ہندوستان کی قید میں رہے۔ ظہیر 1990ء میں کیبنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حسن ظہیر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے موضوع پر لکھنے کے لئے کافی موزوں شخص تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آکسفورڈ پریس نے اس موضوع پر لکھنے کے لئے ان تک رسائی بھی حاصل کی۔

حسن ظہیر کی کتاب ایک علمی کاوش ہے جس میں انہوں نے بنگالی قومیت کے عروج، مشرقی و مغربی پاکستان کے کشیدہ تعلقات اور سابق مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی زیادتیوں وغیرہ پر کھل کر روشنی ڈالی ہے۔ جنوبی ایشیا کا ہر طالب علم اس کتاب کو تاریخی اہمیت کا حامل پائے گا۔ کیونکہ یہ کتاب ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جو حالات کا عینی شاہد ہے اور جس پر خود بھی بہت کچھ گذری ہے۔ ظہیر نے بنیادی ماخذ سے استفادہ کرنے کے علاوہ بعض غیر شائع شدہ دستاویزوں اور 1971ء میں ڈھاکہ میں موجود پاکستانی ارباب اقتدار سے انٹرویو اور گفتگوؤں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ جو بات کتاب کو خصوصی اہمیت اور دلچسپی کا باعث بناتی ہے وہ یہ ہے کہ ظہیر نے پاکستانی فوج کی زیادتیوں اور یحییٰ خاں کی غلط پالیسیوں کی بے لاگ تنقید کی ہے۔ انہوں نے پاکستانی پریس کو بھی لتاڑا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر بنگالی قومیت کے بارے میں اپنے قارئین کو غلط اطلاعات فراہم کیں۔ ظاہر ہے اس قدر اہمیت کی کتاب دنیا کے ماہرین کے علاوہ خود ہندوستان میں موجود تاریخ داں پڑھنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن کسٹم افسران ایسے جذبات سے خالی ہیں۔ انہوں نے اکتوبر 1994ء سے اس کتاب کی دو سو کاپیاں ضبط کر رکھی ہیں۔ کتاب کے ناشرین کے کسی بھی سوال کے جواب میں وہ بس ایک ہی بات کہتے ہیں کہ "کتاب میں قابل اعتراض مواد موجود ہے"۔ بار بار پوچھے جانے کے باوجود بھی کتاب کے قابل اعتراض حصوں کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ دراصل

> کسٹم کے افسروں کا کہنا ہے کہ کسی بھی کتاب کو قابل اعتراض قرار دینے کا طریقہ ایک انتہائی اہم سرکاری راز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی کتاب کو بغیر وجہ بتائے، محض قابل اعتراض کہہ کر ضبط کرسکتے ہیں

کسٹم کے افسروں کا کہنا ہے کہ کسی بھی کتاب کو قابل اعتراض قرار دینے کا طریقہ ایک انتہائی اہم سرکاری راز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی کتاب کو بغیر وجہ بتائے، محض قابل اعتراض کہہ کر ضبط کرسکتے ہیں اور ناشرین اس ضمن میں کچھ نہیں کرسکتے سوائے اس کے کہ ایک آفس سے دوسرے آفس تک دوڑ لگاتے رہیں۔ آکسفورڈ پریس گذشتہ گیارہ مہینوں سے اسی قسم کی بھاگ دوڑ میں مصروف ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اسے کب کامیابی ملے گی یا کسٹم کے افسروں کو کب اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ ☆☆

میں نے مسیحی پارٹی کی رکنیت ترک کر دی کیونکہ

قلب و روح اور ذہن و فکر کے ساتھ میں اسلام کی امان میں آگیا ہوں

جرمن شہری کے قبول اسلام پر مسیحی ڈیموکریٹک پارٹی میں ہلچل

حالیہ چند ماہ میں جرمنی میں شائع ہونے والی متعدد کتابوں اور تحقیقی مطالعات میں ایسی مطبوعات کی خاصی تعداد ہے جن کا تعلق اسلام، اسلامی عقائد اور مشرق وسطی کی سیاست و اقتصاد اور عرب اور اسلامی دنیا کے مختلف معاملات سے ہے۔ جرمنی میں منظر عام پر آنے والی دو تازہ ترین کتابیں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ایک کتاب کا عنوان ہے "مختلف سمتیں اور افکار: ایک جرمن کا قبول اسلام۔ اس کے مصنف کرسٹیان حافمین ہیں۔ دوسری کتاب بعنوان "عالم اسلام اور مغرب" معروف دانشور برنارڈ لیوس کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔

47 سالہ کرسٹیان حافمین مسیحی ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر دفتر کے نمایاں عہدیداروں میں سے ہیں۔ واضح رہے کہ اس پارٹی کے سربراہ جرمنی کے چانسلر جناب ہلمٹ کول ہیں۔ اول الذکر کتاب جرمنی کے شہر بون میں واقع بوویر پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی ہے اور 250 صفحات پر مشتمل ہے۔

کرسٹیان بافمین اقتصادیات کی تدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ پارٹی میں رہنے کے دوران انہوں نے اسلام قبول کیا لیکن اس کے سکریٹری جنرل سے اختلافات ہوجانے کے بعد رکنیت سے دستبردار ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسیحی ڈیموکریٹک پارٹی کے ذمہ داران سے بافمین کی چپقلش اور اختلاف کا اصل سبب ان کا قبول اسلام نہیں تھا۔ یہ پارٹی تو عیسائیت اور اس کی اجتماعی، ثقافتی اور معاشرتی اقدار کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ بافمین اپنے قبول اسلام کے اسباب پر اکثر و بیشتر روشنی ڈالتے رہتے تھے اس سے کسی کو پریشانی نہیں تھی لیکن ارباب جماعت کی نظریں اس وقت بدلیں جب اسلام کے محاسن پر انہوں نے باقاعدہ کتاب قلم بند کی۔ یہ بات انہیں کب گوارا ہوتی۔ آخر ایک شور اور ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ایسی صورت میں بافمین نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ پارٹی کی رکنیت سے دست کش ہوجائیں کیونکہ وہ اپنے قلب و روح اور ذہن و فکر کے ساتھ اسلام کی امان میں آچکے تھے۔

ان کے اسی جذبے سے متاثر ہوکر پارٹی کے بعض ارکان بافمین کی مدافعت کے لئے اٹھے اور ان کے خلاف چلائی گئی مخالفانہ تحریک کا مقابلہ کیا۔ اس ضمن میں سرفہرست جو نام آتا ہے وہ ہے بون سے پارٹی کی نمائندگی کرنے والی ممبر پارلیمنٹ ایڈتھ لیمباخ جنہوں نے بافمین کے نکتہ چینوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مصنف پر اعتراض وتنقید اور غیر منصفانہ حملہ کرنے سے پہلے کتاب کے مشمولات پر تو نظر ڈالیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بافمین نے پوری کتاب میں بڑا موضوعی نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور اس میں کہیں سے تعصب و جارحیت کی جھلک نہیں ملتی۔

بافمین نے مسیحیت کے بنیادی تصور ازلی گناہ اور انسان کے اس میں ملوث کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام ایسے کسی گناہ کے تصور کا قائل ہی نہیں ہے اور انسان کو اس سے پوری طرح بری کرتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ازلی گناہ کے تصور کا غلبہ خود ان کے ذہن پر بھی اس وقت تک رہا تھا کہ جب تک کہ انہوں نے اسلام کا مطالعہ کرکے دین سے واقفیت حاصل نہیں کرلی۔ بافمین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلام اور حقیقی ڈیموکریسی کے درمیان عام خیال کے برعکس بڑا گہرا ربط ہے۔

برنارڈ لیوس کی تحریریں علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ پرنسٹن یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے شعبے سے بحیثیت پروفیسر 1986ء تک وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے اسلام کے سیاسی پہلو، اسلامی بیداری اور آج کی دنیا میں اسلام کی حیثیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ مشرقی تہذیب پر مغربی استعمار کے اثرات اور آج کی دنیا کو اپنے اشارے پر نچانے والے سیاسی عوامل اور سوویت یونین کے زوال کے بعد وسط ایشیا میں اسلامی جمہوریتوں کی صورت حال کو بھی اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔

جانداروں کی تصویر والے کپڑے پہننا ناپسندیدہ عمل ہے

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال: — اس حدیث کی بنیاد پر جس میں کسی بھی نشہ آور شے کے استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ایسی کوئی دوا یا مشروب (مثلاً کوکا کولا) استعمال نہیں کرنا چاہئے جس میں الکحل کسی بھی مقدار میں شامل ہو۔ اور جب ایسا ہے تو یہ کہنا کہاں تک حق بجانب ہے کہ جن چیزوں میں غیر حلال چیزوں کی برائے نام مقدار شامل ہو ان کے استعمال کی اجازت ہے اور یہ کہ غریبوں اور محتاجوں کو دینے کی غرض سے بینک کا سود لیا جاسکتا ہے؟

جواب: — کسی چیز میں اگر کسی ناجائز عنصر کی برائے نام آمیزش ہے تو ایسا نہیں کہ اس کا استعمال جائز ہوجائے گا۔ جو چیز حرام ہے وہ حرام ہر صورت میں رہے گی اس کی مقدار خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اس کا اطلاق خصوصاً نشیلے مشروبات پر ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً منع فرمایا ہے کہ جس مشروب کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرتی ہے تو اس کا ایک گھونٹ بھرنا بھی حرام ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی مشروب میں نشیلے اجزاء کی ہلکی مقدار میں آمیزش بھی ایک مسلمان کے لئے اسے حرام یعنی ناقابل استعمال بنا دیتی ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو چکی تو اب آیئے الکحل کی طرف۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی چیز میں الکحل کی مقدار اتنی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شے جس میں الکحل ملی ہوئی ہے حرام ہے کیونکہ کوئی شخص وہ چیز کسی بھی مقدار میں استعمال کرسکتا ہے اور اسے نشہ نہ ہو۔ مثال کے طور پر الکحل کی مقدار ڈبل روٹی اور دہی جیسی اشیاء میں دو سے تین فیصد تک ہوتی ہے۔ اب ڈبل روٹی اور دہی کوئی شخص کتنی بھی کھاسکتا ہے لیکن نشے جیسی کوئی کیفیت اس پر طاری نہیں ہوگی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ الکحل کی مخصوص فیصد کی موجودگی کی بناء پر ان دونوں چیزوں کا استعمال ممنوع ہے یا وہ حرام ہیں۔ اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو اسے اپنے دعوے کی دلیل میں ٹھوس ثبوت پیش کرنے ہوں گے۔ یہی صورت حال کوکا کولا کی ہے۔ الکحل کی ہلکی سی مقدار اس مادے کو حل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس سے کہ یہ مشروب تیار ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں چھوٹے بچے بھی کوکا کولا کی کئی بوتلیں دن بھر میں پی جاتے ہیں اور ان پر کسی طرح کا منفی اثر نہیں ہوتا۔ پورا پیپا بھی اگر کوئی خالی کردے تو خمار کی کیفیت کا شائبہ تک اس میں پیدا نہیں ہوگا۔ تو یہ دعوی کیسے کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے مشروبات شرعاً ممنوع ہیں۔ جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا تعلق ان مشروبات سے ہے جو نشہ پیدا کرتے ہیں نہ کہ غیر نشیلے مشروبات سے۔

آپ دیکھتے ہیں چھوٹے بچے بھی کوکا کولا کی کئی بوتلیں دن بھر میں پی جاتے ہیں اور ان پر کسی طرح کا منفی اثر نہیں ہوتا۔ پورا پیپا بھی اگر کوئی خالی کردے تو خمار کی کیفیت کا شائبہ تک اس میں پیدا نہیں ہوگا۔ تو یہ دعوی کیسے کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے مشروبات شرعاً ممنوع ہیں۔

الکحل ملی ہوئی دواؤں پر بھی اسی پیمانے کا انطباق ہوتا ہے۔ اگر ایسی دوائیں کوئی نشیلا اثر استعمال کرنے والے میں پیدا کرتی ہیں تو یقیناً وہ حرام ہیں کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا ہے کہ ہمیں اپنی بیماریوں کا علاج ایسی چیزوں سے نہیں کرنا چاہئے جن کا استعمال یا سہارا لینا اللہ نے ممنوع ٹھہرایا ہے۔

جہاں تک سود کا تعلق ہے تو کسی شخص کو ایسے بینک میں اپنی رقم رکھنے کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا جہاں سے سود کمایا جائے۔ اس میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی بینک جمع شدہ رقم پر سود دیتا ہے تو سود کی رقم وہ بینک کے پاس نہ چھوڑیں، نہ ہی اس رقم کو اپنے ذاتی مصرف میں لائیں۔ اور نہ ہی یہ سوچ کر کہ وہ مخصوص رقم سود کی ہے اسے نذر آتش کریں۔ یہ تینوں عمل ناپسندیدہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سود کی رقم کا کیا مصرف ہو۔ تو اس کا واحد طریقہ ہے کہ سود کے مد میں آئی ہوئی اس رقم کو امت مسلمہ کے کسی رفاہی کام میں خرچ کیا جائے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کسی انسان کو کبھی ایسی صورت حال کا سامنا ہوسکتا ہے کہ فقر و فاقہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر اسے وہ چیز کھانی پڑے جو حرام ہو یا ایسے فعل کا مرتکب ہونا پڑے جو حرام ہو۔ مثال کے طور پر ہوسکتا ہے سیلاب یا قحط زدہ افراد خنزیر یا دوسرے ممنوع جانور کھانے پر مجبور ہوجائیں۔ وہ ایسے میں خوراک کا انتظام کرنے کے لئے سود میں ملی ہوئی رقم کا استعمال بھی کرسکتے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت بھی کردی جائے کہ بے شک ہمیں اپنے اندر یہ عادت نہیں پیدا کرنی چاہئے کہ بینک سے برابر سود وصول کرکے غریبوں اور محتاجوں کو امداد پہنچاتے رہیں لیکن اگر بینک کی طرف سے ہمیں کوئی ایسی رقم ملے تو اس کا جائز ترین مصرف وہی ہوگا جس کا ذکر سطور بالا میں گذرا اور بہت سے ہمعصر علماء کا اس پر اتفاق ہے۔

ایسی دوائیں جو استعمال کرنے والے میں نشیلا اثر پیدا کرتی ہیں یقیناً حرام ہیں کیونکہ اللہ کے رسولؐ نے سختی سے منع فرمایا ہے کہ ہمیں اپنی بیماریوں کا علاج ایسی چیزوں سے نہیں کرنا چاہئے جن کا استعمال یا سہارا لینا اللہ نے ممنوع ٹھہرایا ہے۔

سوال: — کیا یہ بات درست ہے کہ کالی یا رنگین قمیض جس پر جانوروں اور پرندوں کی تصویر بنی ہو پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے؟

جواب: — ایسی قمیض جس پر جانداروں کی تصویر چھپی ہو پہننے کی عموماً حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کے چھاپے والے لباس کو ناپسند فرماتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ میں ایسے پردے لگائے گئے جن پر کچھ جانور وغیرہ یا ان سے ملتے جلتے ڈیزائن تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت دی کہ ان پردوں کو اتار دیا جائے کیونکہ وہ دوران عبادت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کو ہٹاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رنگین یا جانداروں کے نقش والے کپڑے پہننا ممنوع تو نہیں ہے ناپسندیدہ ضرور ہے۔

مریض کے لئے خون خریدتے وقت ہوشیاری برتیں

اس حیات بخش سیال کے ساتھ کھلواڑ کریں گے تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے

تمام انسانوں اور جانوروں کے جسم میں دوڑتے ہوئے آکسیجن، معدنیات اور دیگر لازمی اجزاء سے متشکل سرخ سیال جسے ہم خون کے نام سے جانتے ہیں وہ انسانی جسم کے ساختیاتی نظام کا اولین اساسی عنصر ہے اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر جاسوسی اور دہشت والے ناولوں کے مصنفوں نے ایسی مخلوق کا کردار پیش کیا جو خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہو جس کی مثال ڈراکیولا کے ناولوں میں ملتی ہے۔

یہ بھی کوئی حیرت ناک بات نہیں کہ عالمی ادارہ صحت نے کئی دہائیوں قبل خون کو ایسی دوا سے تعبیر کیا تھا جو انسان کو امراض سے شفایابی میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے اور اس وقت تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہے گی جب تک اس کا نعم البدل تلاش نہیں کرلیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ خواہ علاج ہو یا تحقیق خون اور اس سے متعلق باتوں کو اولین اہمیت دی جاتی ہے خصوصا جب قدرتی یا انسان کی لائی ہوئی آفتوں کے سبب کسی ادارے یا ایجنسی کی وساطت سے خون کی فراہمی کی ضرورت درپیش ہو۔

صلیب احمر یا ریڈ کراس کے زیر اہتمام 1930ء میں کلکتہ میں سب سے پہلا بلڈ بینک قائم ہوا تھا۔

حکومت کے قائم کردہ بلڈ بینک پیشہ ور عطیہ دہندگان سے خون نہیں لیتے لیکن 1964ء تک جب پہلی بار رضاکارانہ عطیات خون قبول کئے جانے لگے تھے تو دس روپے فی بوتل کے حساب سے لوگوں سے خون خریدا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بلڈ بینکوں سے وابستہ افراد کا بیان ہے کہ میڈیکل کالجوں کو خون بیچنے والوں کی قطار میں پانچ ساڑھے پانچ سو آدمی کھڑے نظر آتے تھے۔ جب سے پرائیویٹ بلڈ بینکوں کا جال پھیل گیا ہے خون کی قیمت 75 روپے فی بوتل ہوگئی ہے۔ پیشہ ور خون فروشوں پر پابندی سب سے پہلے 1985ء میں مغربی بنگال کی حکومت نے عائد کی۔ اس اقدام کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ پیشہ ور خون فروش زیادہ تر قحبہ خانوں میں آمد و رفت کے عادی ہوتے ہیں اور بعض اس کے ساتھ نشیلی چیزوں کے استعمال کی لت میں بھی مبتلا ہوتے ہیں اس لئے ان سے ایڈز کے تعدد کا خطرہ کافی حد تک پیدا ہوجاتا ہے۔ ایڈز کے تعدد کے علاوہ ایک اور مضر پہلو خون کے اندر آلودگی کی موجودگی کا تھا جس کی طرف توجہ 1985ء میں دی گئی اور آر ای ایچ اے طریقہ کار کے ذریعہ ہیپی ٹائٹس بی۔ وائرس کی جانچ کی جانے لگی۔

مثلا جب کبھی خون کی ضرورت ہو تو اس کے ذریعہ حصول کے ضمن میں پہلی ترجیح کسی رشتہ دار یا دوست کو دی جائے جس کے خون کا زمرہ اور اس کے آر ایچ عوامل مریض کے خون سے مطابقت رکھتے ہوں

خون کی فراہمی کے چار ذرائع ہیں ان میں اول الذکر دو ذرائع پیشہ ور اور رضاکارانہ طور پر عطیہ دہندگان ہیں جو عطیہ خون کے کیمپ میں جاکر خون دیتے ہیں اور وہاں سے ان کو آئندہ کے لئے شناختی کارڈ جاری کردیا جاتا ہے۔ اس نے جو خون کا عطیہ دیا ہے اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نام جاری کردہ شناختی کارڈ دکھا کر اگر اسے خون کی ضرورت کبھی پڑجائے تو بلا قیمت حاصل کرسکتا ہے۔ اس طرح کے کارڈوں کی مدت صلاحیت ایک سال تک رہتی ہے۔

بلڈ بینک سے حاصل کردہ خون میں ملاوٹ کے امکان کی طرف سے ہوشیار افراد اور اطباء کا اصرار ہمیشہ اس بات پر ہوتا ہے کہ کسی خطرناک صورت حال یا عام حالات میں بھی مریض کے رشتے داروں کو چاہئے کہ خون کا عطیہ دینے کے لئے کسی ایسے رشتے دار کو آمادہ کریں جس کے خون کا زمرہ اور اس کے آر ایچ متعلقات مریض کے خون سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اور یہ ہمیشہ ممکن نہیں ہوپاتا کہ عطیہ دینے والے کا خون مریض کے نمونے سے مل جائے اس لئے ایک چوتھی صورت کا سہارا لیا گیا اور وہ ہے عطیہ خون کا تبادلہ۔ فرض کیجئے عطیہ دینے والا شخص مریض کا دوست یا رشتہ دار ہے اور خون دینے پر آمادہ ہے لیکن اس کا خون مریض کے زمرہ خون کے مطابق نہیں ہے۔ تو وہ کسی بلڈ بینک میں جاکر ایک یونٹ خون دے دے گا اور اس کے عوض بینک سے مطلوبہ زمرہ کا خون بلڈ بینک سے اس کے مریض کے لئے مل جائے گا۔

بلڈ ٹرانزفیوژن کے میدان میں نئی نئی نزاکتوں اور تحقیقات کے سامنے آنے سے تبادلائی طریقہ کار میں بھی بڑے خطرات پوشیدہ ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ بعض بنیادی باتوں کو ذہن نشیں رکھا جائے۔ مثلا جب کبھی خون کی ضرورت ہو تو اس کے ذریعہ حصول کے ضمن میں پہلی ترجیح کسی رشتہ دار یا دوست کو دی جائے جس کے خون کا زمرہ اور اس کے آر ایچ عوامل مریض کے خون سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس کے لئے لازم ہے کہ آدمی کو خود اپنے زمرہ خون کا علم ہو اور اس کے پاس ایسے منتخب افراد کی ایک فہرست ہو جن کا خون اس سے مماثل ہے۔ اگر بلڈ بینک سے خون حاصل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے تو اس کا خیال رہے کہ وہ بینک کسی معتبر ادارہ یا تنظیم کا ہو۔ ایسے بلڈ بینک جابجا مل جائیں گے جن میں موجود خون کے اسٹاک کی جانچ مطلوبہ وقفوں سے نہیں بلکہ اسی وقت ہوتی ہے جب ڈرگ کنٹرول کا عملہ معائنے پر آتا ہے۔

خون کے پولی پیک کی اچھی طرح دیکھ بھال کرلی جائے کہ اس پر زمرہ خون، تاریخ انتہا کی نشاندہی صحیح طور پر کی گئی ہے اور اس پر وائرس اور بیکٹیریا سے پاک ہونے کی ضمانت درج ہے یا نہیں

خون کے پولی پیک کی اچھی طرح دیکھ بھال کرلی جائے کہ اس پر زمرہ خون، تاریخ انتہا کی نشاندہی صحیح طور پر کی گئی ہے اور اس پر وائرس اور بیکٹیریا سے پاک ہونے کی ضمانت درج ہے یا نہیں بلڈ بینکوں کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ ہیپی ٹائٹس، ملیریا، تناسلی امراض اور ایچ آئی وی کا پتہ لگانے کے لئے خون کی جانچ کریں۔ اس کا خاص طور پر دھیان رکھا جائے کہ خون کی بوتل میں نکلنے اور مریض کے جسم میں منتقل کرنے کے لئے ڈسپوزیبل سرنج اور سوئی کا ہی استعمال کیا جائے۔

اس حیات افزا اسہال کے ساتھ کھلواڑ یا لاپرواہی برتنے سے یقینا زندگی سے ہاتھ دھونا پڑسکتا ہے۔ خون کی سیاسی، نسلی اور مذہبی حدود نہیں ہوتیں۔ رحیم کا خون رام کے جسم میں منتقل کردیا جاتا ہے چونکہ انسانی زندگی کے تحفظ میں کسی تفریق کا گذر نہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد خون کا عطیہ دینے کے لئے آگے بڑھیں اور حکومت کو خطرات سے پاک خون کی دستیابی کی ضمانت کے لئے موثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

بقیہ: رشدی کی ذہنی کیفیت بتاتی ہے کہ وہ پاگل ہوجائے گا

سے بھی آگاہ کررہا ہے۔ یہ ہے رشدی کی موقع پرستی اور عیاری کی ایک روشن مثال۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے جیسا کہ قارئین کو یاد ہوگا کہ ایرانی فتوے کے تین سال بعد رشدی نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا تھا اور پھر مصلحت دیکھ کر اس اعلان سے منحرف ہوگیا۔

ادھر کچھ دنوں سے رشدی ٹی وی پر نظر آنے لگا ہے۔ اسی ماہ روزنامہ ٹائمز کے زیر اہتمام "ادیب بالمقابل ریاست" کے موضوع پر منعقد ایک عام مباحثہ میں اس نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے برخلاف شرکت کی۔ ممکن ہے عالمی سیاست کی کروٹوں سے رشدی اور اس کے حامیوں کی کچھ امید بندھی ہو۔ بعض حلقوں کے نزدیک رشدی کی حمایت میں عالمگیر تحریک چلانے کا سہرا آرٹیکل 19 کے تحت انسانی حقوق کی جماعت کی سربراہ فرانس ڈی سوزا کو جاتا ہے جو یوروپی برادری کو یہ احساس دلانے میں کامیاب رہی ہیں کہ رشدی کی زندگی واقعی خطرے میں ہے اور وہ اس خطرے کی سنگینی کو کم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اس ضمن میں ایرانی حکومت کے آئندہ ارادے اور موقف کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر ہاشمی رفسنجانی اور ان کے ہمنوا ایرانی لیڈر مغرب کو یہ یقین دلانے کے خواہاں ہیں کہ رشدی کے تعاقب میں سرفروشوں کی جماعت نہیں بھیجی جائے گی اور نہ ہی اس کے سر پر انعام رکھا جائے گا۔ اپنے موقف میں اس لچک کے بدلے ایران کو جو چیز حاصل ہونے والی تھی وہ تھی ایران اور مغرب کے درمیان تعلقات کی استواری۔ لیکن جانبین کی آرزو اس وقت خاک میں مل گئی جب فتویٰ واپس لینے کے مسئلہ پر رفسنجانی کے حریفوں نے ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ اور دونوں کے درمیان تجارتی تعلقات کی استواری سردست معلق ہوگئی۔ دراصل شیطان رشدی کا معاملہ اتنی آسانی سے حل نہیں ہوگا یہ ایک شیطانی چکر ہے اور اس چکر کے زیادہ دنوں تک چلنے کے امکانات ہیں۔ ☆☆☆☆☆

بقیہ: خواہشات کے طوفان نے دونوں کو ایسا گھیرا کہ

پوری کوشش کرنی چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص عبادات پر کاربند ہو اور جیسا کہ توقع کی جاتی ہے عبادات انسان کو گناہ کے راستے پر چلنے سے روکتی ہیں تو اس کا اثر ضرور پڑے گا لیکن عبادات کی اہمیت اور آیات قرآنی کے مفہوم کو سمجھ لینے پر یہ اثر مزید گہرا ہوجاتا۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات سے واقفیت کی ضرورت پر خصوصی تاکید فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا کہ سو نمازیوں کے مقابلے میں ایک عالم سے نبرد آزما ہونا شیطان کے لئے زیادہ مشکل ہے۔ غرضیکہ اگر سائل شادی شدہ نہیں ہے تو اسے فورا شادی کرنی چاہئے۔ اسے اپنا حلقہ احباب بدل کر عبادت گزار اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے اور اسلام کی معلومات میں اضافہ کرکے انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہئے

قارئین اور ایجنٹ حضرات سے

الحمد للہ ملی ٹائمز نے ایک سال سے زائد کی مدت بخیر و خوبی پوری کرلی ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اسے ایک منفرد اور مثالی اخبار بنائیں۔ ملی ٹائمز نے اپنی ایک شناخت اور پہچان بنائی ہے۔ کوئی دوسرا اخبار اس وقت اس کے پایے کا نہیں ہے۔ ہم نے اسے امت کی امنگوں اور آرزوؤں کا سچا ترجمان بنانے کی کوشش کی ہے۔ لغزشوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ماضی کی غلطیوں سے حال کو خوش آئند بنانے کی تلقین کی ہے۔ امت کے خلاف ہونے والی سازشوں سے خبردار کیا ہے۔ ہم نے سچی اور بیباک صحافت کی روش کو اپنایا ہے اور مصلحتوں سے دامن نہیں چرایا۔ اس دوران آپ کا ہمیں جس طرح تعاون ملا ہے اور جس طرح آپ نے ہماری پذیرائی کی ہے اس سے ہمیں بڑا حوصلہ ملا ہے۔

لیکن گذشتہ ایک سال سے کس طرح ہم یہ اخبار نکال رہے ہیں، مسائل سے کس طرح نبرد آزما ہیں بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ اخبار تجارت کی غرض سے نہیں نکالا جارہا ہے بلکہ ایک مشن اور تحریک ہے۔ لاگت سے بھی کم پر ہم اخبار آپ کو پیش کررہے ہیں۔ لیکن مسلسل خسارہ زیادہ دنوں تک ادارہ برداشت نہیں کرسکتا۔ آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی قیمت میں ایک روپے کا معمولی اضافہ کرنے پر مجبور ہیں۔ لہذا نومبر 1995ء سے ملی ٹائمز کی قیمت پانچ روپے ہوگی۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ملی ٹائمز جاری رہے آپ کے احساسات و آرزوؤں کی ترجمانی کرے، کھری اور سچی صحافت کی راہ پر گامزن رہے تو اس کے ساتھ تعاون کیجئے اور اس کی توسیع و اشاعت میں بھرپور حصہ لیجئے۔ اسے گھر گھر پہنچایئے۔ نئے خریدار فراہم کیجئے۔ نئی ایجنسیاں قائم کروایئے۔

(ادارہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اقتصادی اور عسکری میدانوں میں امریکی امداد بند ہو جائے تو

اسرائیل اپنے فوجی بوجھ تلے دب جائے گا

> ملی ٹائمز میں تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں۔ تبصرے کے لئے کتابوں کے انتخاب کا حتمی فیصلہ ادارہ کرے گا البتہ وصول ہونے والی کتابوں کا اندراج ان کالموں میں ضرور ہوگا۔ (ادارہ)

دمشق میں مقیم فلسطینی محقق ڈاکٹر فضل نقیب نے اپنی کتاب "اسرائیلی اقتصادیات اور صیونی منصوبہ" میں جو بیروت کے موسسہ دراسات فلسطینیہ سے شائع ہوئی ہے، درآمدات پر اسرائیل کے انحصار کو مرکزی موضوع بنایا ہے۔ واضح رہے کہ 1980ء کی دہائی کے اواخر میں اسرائیلی درآمدات کا حجم مجموعی قومی پیداوار کا پچاس فیصد تھا اور اب وہ 70 فیصد ہوچکا ہے۔ اسی طرح ایکسپورٹ بھی پہلے اگر 54 فیصد تھی تو اب وہ 34 فیصد رہ گئی ہے۔ دونوں کے درمیان کمی کو امریکی اور بیرونی امداد سے پورا کیا جارہا ہے۔ اس طرح کہ اس کمی کا تقریبا 70 فیصد حصہ تنہا نویں دہائی تک امریکی امداد سنبھالتی رہی ہے۔

کتاب کا چھٹا باب خصوصی اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ اس میں مصنف نے اسرائیلی اقتصادیات کے بعض اہم موضوعات کو چھیڑا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے صیونی فوجی ادارے سے بحث کی گئی ہے۔ اس ادارے کی اہمیت انہوں نے ان الفاظ میں واضح کی ہے کہ اسرائیلی حکومت نے اس ادارے کو عرب اسرائیل تنازعے میں جنگی حکمت عملی کے فعال مرکز کی حیثیت دی ہے تاکہ اسرائیلی فوج مشرق وسطی میں سب سے بڑی فوجی طاقت بن جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اسرائیل کے بڑے سے بڑے اخراجات کے لئے اسرائیل کی آمادگی پر مصنف نے خاص طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ فوجی اخراجات بھی کافی حد تک امریکی امداد کے بل بوتے پر پورے کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ امداد کھینچ لی جائیں تو عین ممکن ہے کہ اسرائیل فوجی اخراجات کے بوجھ سے دب کر رہ جائے۔ اس باب میں اسرائیل کی فوجی صنعت اور اس میں کام کرنے والے افراد کی تعداد وغیرہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور اسرائیل اور امریکہ کے درمیان فوجی اقتصادی اور صنعتی میدانوں میں تعاون کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کلنٹن

تصویر کے دوسرے رخ کے طور پر کتاب میں اسرائیلی تسلط کے سائے میں فلسطین کی اقتصادی صورت حال بھی بیان کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسرائیل نے فلسطینی آراضی تو غصب کی ہی تھی قدرتی وسائل مثلا پانی اور بجلی اور دیگر اشیاء کی تقسیم میں بھی فلسطینیوں کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے۔

کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر فضل نقیب نے بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں اور اس موضوع میں دلچسپی رکھنے والے افراد کو فکر و بحث کی نئی راہیں دکھلائی ہیں اور بعض علمی نتائج اخذ کئے ہیں۔

مصنف نے جن دو اہم معاملات میں اسرائیل کی صلاحیت کو کسی حد تک مشتبہ قرار دیا ہے وہ ہیں کہ کیا اسرائیل زیادہ دنوں تک اپنی اقتصادیات کو اسی نہج پر چلا سکے گا اور یہ کہ کیا اسرائیل کے لئے مشرق وسطی میں مجوزہ علاقائی تعاون کے منصوبے کا عملی خاکہ تیار کرنا ممکن ہوگا۔ پہلے سوال کے جواب میں مصنف کا اندازہ یہ ہے کہ اسرائیل عالمی سطح پر وقوع پذیر تبدیلیوں کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرے گا۔ خصوصا جب کہ عالمی تجارت کی تنظیم وجود میں آچکی ہے اور اس کے پیش نظر وہ آزاد اقتصادی نظام کے قیام کے لئے قدم اٹھائے گا۔ اور ایسا کرنا اسرائیل کے لئے ناگزیر بھی ہے کیونکہ لیبر پارٹی کی حکومت اقتصادی اصلاحات کے موضوع کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔

امریکی امداد پر انحصار

جہاں تک اسرائیل کی طرف سے علاقائی تعاون کے منصوبے کے وضع کئے جانے کا سوال ہے تو یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسرائیل اس خطے کو ایسی کوئی چیز نہیں فراہم کرنے والا ہے جسے شرق اوسط کے بازار کا نام دیا جائے۔ بلکہ اس موضوع کا تعلق آنے والے دنوں سے ہے۔ سردست جو بات غور طلب ہے وہ مشرق وسطی تک محدود علاقائی تعاون کی ایک تنظیم کا قیام ہے لیکن اس تعاون کا دائرہ کار بھی محدود ہوگا جس کے اختیارات میں علاقائی دارے اور مجالس کی تشکیل ہی شامل ہوں گی۔ جیسے علاقائی بینک اور بنیادی سہولتوں یعنی بجلی، پانی اور سڑکوں سے متعلق اسکیمیں۔ ان سب کے بعد جس کام کی باری آتی ہے وہ ہے آزاد تجارت کے علاقوں کی تجدید اور دو طرفہ تعلقات۔ موجودہ امریکی۔ اسرائیلی منصوبوں میں اسی نقطہ نظر کو مرکزیت حاصل ہے۔ اس بنا پر مشرق وسطی کی سطح پر علاقائی اقتصادی تعاون کا کوئی منصوبہ پیش کرنے کے لئے اسرائیل کی آمادگی سے متعلق شکوک سر ابھارتے ہیں۔

یہ کتاب عرب۔ اسرائیل تنازعے کی مختلف جہات کی تفہیم کی غرض سے عربی میں لکھی جانے والی کتابوں کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو نہ صرف اسرائیلی اقتصادیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ اسرائیل کو حاصل امریکی اور یوروپی حمایت کے اسباب سے بھی بحث کرتی ہے۔ عرب۔ اسرائیل تعلقات کی آئندہ کروٹوں کے اندازے میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کو یہ کتاب مفید معلومات فراہم کرے گی۔

آپ کی الجھنیں

خواہشات کے طوفان نے دونوں کو ایسا گھیرا کہ نکلنے کا راستہ ہی نہ بچا

> اگر آپ کسی الجھن میں بمتلا ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلہ نہ لینے کی پوزیشن میں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ (ادارہ)

سوال :۔۔۔ میں سردست سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہوں۔ یہاں آنے سے قبل میرے روابط ایک غیر مسلم عورت سے تھے۔ اس سے کئی بار جنسی اختلاط بھی مجھ سے سرزد ہوا۔ اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ میں نے بارہا اس کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کی قربت و کشش نے مجھے روزہ نماز سے بھی بیگانہ کردیا تاہم ارتکاب گناہ کے ساتھ ہر بار مجھے احساس گناہ بھی ہوتا تھا۔ ہر ملاقات میں یہی ارادہ کرتا تھا کہ اب یہ آخری ملاقات ہوگی لیکن اس کو سامنے پاکر خود سے کئے گئے عہد پر ثابت قدم نہ رہ سکتا تھا اور قدم بہک جاتے تھے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے پختہ عزم کرلیا کہ اب اس عورت یا کسی کے ساتھ گناہ میں ملوث نہیں ہوں گا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس عزم پر قائم رہنے کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ مجھے براہ کرم ایسا مشورہ دیں کہ مستقبل میں کسی بھی ترغیب گناہ کو ٹھکرا سکوں اور اپنے عزم کی تکمیل کرسکوں۔ میری شدید خواہش ہے کہ اسلام کی مقررہ جات حدود میں رہ کر زندگی گزاروں؟۔

جواب :۔۔۔ کسی انسان کے بجائے آپ کو اللہ سے ہی مدد اور نصرت طلب کرنی چاہئے۔ وہی آپ کی مدد کرے گا، آپ کے عزم و ارادہ کو تقویت دے گا اور نفسانی خواہشات کے سامنے ثابت قدم رہنے کا حوصلہ عطا کرے گا۔ بندہ تو صرف یہ کرسکتا ہے کہ آپ کو یہ بتادے کہ اللہ کی نصرت و مدد کا طالب کس طرح ہوا جاتا ہے۔ آپ کی مشکل پر اول تا آخر غور کرنا ضروری ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ عورت کے ساتھ جو سلوک آپ نے کیا وہ سنگین ترین جرم ہے۔ یقینا اس کی پیش قدمی یا اللہ کی نافرمانی کے عمل میں نفسانی ترغیب کا بڑا ہاتھ رہا ہوگا۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ خواہشات کے طوفان نے آپ دونوں کو ہر طرف سے گھیر لیا کہ نکلنے کا راستہ ہی نہیں تھا۔

تاہم ایسا کوئی گناہ نہیں جس کے لئے توبہ کے دروازے کھلے نہ ہوں۔ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ کوئی بندہ جب اس کی بارگاہ میں اپنے گناہوں پر سچے دل سے نادم ہوکر اور آئندہ اس کے عدم ارتکاب کا عزم لے کر حاضر ہوتا ہے تو وہ اس کی توبہ ضرور قبول کرتا ہے۔ اگر توبہ اور گناہ سے بچنے کے عزم کے باوجود دوبارہ آدمی خواہشات بیجا میں گرفتار ہوجائے تو اللہ بھی اس کی گذشتہ توبہ کو عدم قبولیت کی مد میں واپس لوٹا دے گا۔ توبہ کرتے وقت کسی شخص کی نیت کیا تھی اس کا دخل اس معاملے میں بہت زیادہ ہے۔ توبہ کی قبولیت کے لئے خلوص نیت اور ارادے کی پختگی ضروری ہے۔ اگر یہ سنجیدگی سے عاری ہو محض الفاظ کا کھیل ہو اور بعض لوگوں کی اتباع میں اس خیال کے تحت کی گئی ہو کہ ابھی تو توبہ کرلیں اور پھر موقع ملتے ہی توڑ دیں گے تاکہ رند بھی بنے رہیں اور جنت سے بے دخل بھی نہ کئے جائیں۔ جس انداز میں سائل نے اپنے مسئلہ کو بیان کیا اس سے اس کی سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاہم اس خلوص کی حقیقت کی تصدیق کرنا کسی بندے کے اختیار میں نہیں ہے یہ تو اللہ ہی ہے جو ہر شخص کے دل کی بات کو جاننے والا اور اس کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس لئے ہر وہ شخص جو اپنی توبہ قبول کروانے کا خواہاں ہو اپنے دل کو برائی کی طرف دوبارہ رخ نہ کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ کرلے اور جب انہیں صحیح معنوں میں اپنی غلطیوں پر ندامت کا احساس ہوگا اسی صورت میں اللہ عزوجل ان کی توبہ قبول کرے گا۔

> اگر توبہ اور گناہ سے بچنے کے عزم کے باوجود دوبارہ آدمی خواہشات بیجا میں گرفتار ہوجائے تو اللہ بھی اس کی گذشتہ توبہ کو عدم قبولیت کی مد میں واپس لوٹا دے گا۔ توبہ کرتے وقت کسی شخص کی نیت کیا تھی اس کا دخل اس معاملے میں بہت زیادہ ہے۔

برائی سے بچنے اور بھلائی اور اللہ کی اطاعت کے راستے پر قائم رہنے کے لئے بھی انسان اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرے۔ جنسی خواہشات کی بناء پر ایمان کے ڈگمگانے کے خطرے سے بچنے کے لئے وہ شادی کرسکتا ہے تاکہ ایک فطری تقاضہ کی جائز ذریعہ سے تکمیل ہوسکے۔ اگر کسی کو شراب نوشی کی بری عادت ہے تو اسے ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے جو شراب نہ پیتے ہوں۔ اس صورت میں اس کے شراب کی طرف راغب ہونے کے امکانات ہلکے ہوجائیں گے۔ اگر وہ کسی ایسی محفل میں مدعو ہو جہاں لوگ شراب نوشی کررہے ہوں تو یا تو وہاں شریک نہ ہو اور اگر شریک ہو بھی تو ایسے کسی شخص کے ہمراہ رہے جو اس کی اس کمزوری سے واقف ہو اور اپنی خواہش پر قابو پانے کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہے۔

اس کے ساتھ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ایسے شخص کو اسلام کی تعلیمات سے اپنی واقفیت میں اضافہ کرنا اور ان کے مطابق زندگی گزارنے کی

بقیہ: صفحہ ۱۸ پر

Invitation Price Rs. 4/-
16 - 31 OCTOBER 1995
Volume : 2, Issue : 20

The Milli Times International
49, Abul Fazal Enclavo, Jamia Nagar, Now Dolhi-110025 Phone:6827018

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-11234/95

ایک مومنہ کے احساسات

سیاہ اسکارف میں ملبوس، آنکھوں میں حیا کی سرخی لئے باوقار انداز میں گھومتی پھرتی چالیس ہزار خواتین کی بھیڑ میں ممتاز اور منفرد نظر آنے والی عائشہ ارم کے لئے بیجنگ کی کانفرنس میں مندوبین کی خصوصی دلچسپی ہے۔ برہنہ پنڈلیوں اور لہراتی زلفوں کی ہماہمی میں عائشہ ارم کے باوقار اور ساتر لباس نے اس کے اسلامی فیشن کے لئے دیگر خواتین کے دلوں میں بے انتہا کریز پیدا کردیا ہے۔ گو کہ عائشہ اس بھیڑ میں تنہا مسلم خاتون نہیں ہیں جو بیجنگ کی حقوق نسواں کانفرنس میں شرکت کے لئے آئی ہے۔ لیکن وہ ان معنوں میں دوسری مسلم خواتین سے ممتاز ہے کہ وہ مسلم معاشرے میں عورتوں کے حقوق کے لئے مسلسل آواز بلند کرتی رہی ہے۔ البتہ غیر مسلم شرکاء کے لئے یہ بات حیرت کا باعث ہے کہ حقوق نسواں پر بے محابہ گفتگو کرنے والی عائشہ بات بات میں قرآن اور حدیث کا حوالہ دیتی ہے۔ ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ کوئی مسلم خاتون خالص اسلامی بنیادوں پر بھی حقوق نسواں کی مہم چلا سکتی ہے اس لئے کہ مغرب اسلام کو عورتوں کے حقوق کا غاصب سمجھتا ہے۔ اور مغرب میں یہ تصور بھی عام ہے کہ اسلام عورتوں کو سیاہ غلاف میں بند کردینے کا قائل ہے۔ اور یہ کہ مذہب کی آڑ میں اسلام نے برقع کے اندر خواتین کی آرزوؤں کو دبا رکھا ہے۔

البتہ جب ایک سیاہ اسلامی اسکارف میں ایک پڑھی لکھی نوجوان مسلم خاتون بیجنگ کی کانفرنس ہال میں چلتی پھرتی نظر آئی تو عام لوگوں کا جذبہ تجسس جاگ اٹھا کہ آخر کوئی مسلمان عورت اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ حقوق نسواں کے جدوجہد میں حصہ لینے کیونکر آسکتی ہے۔ بیشتر شرکاء کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ عائشہ اپنے اس لباس پر نہ صرف یہ کہ تفخر کا احساس رکھتی ہے بلکہ مغربی خواتین کے رنج و غم کے لئے بھی انہی اسلامی اقدار کے نفاذ کو ضروری سمجھتی ہے جس کے وقار کی علامت اسلامی اسکارف سمجھا جاتا ہے۔

عائشہ کہتی ہیں کہ بیجنگ کی کانفرنس سے میں فخر اور شرم کے جذبات کو لے کر لوٹی ہوں۔ فخر اس بات پر کہ قانونی طور پر مسلم خواتین وہ سب کچھ حاصل کرچکی ہیں جن کے لئے ابھی مغرب میں جدوجہد کا آغاز ہوا ہے۔ البتہ یہ بات انتہائی باعث شرم ہے کہ اسلام کے عطا کردہ حقوق کو موجودہ مسلم معاشرے نے عورتوں سے چھین لیا ہے۔ ذرا تصور کیجئے دور نبوی میں اسلامی تحریک میں عورتوں کی شمولیت، ان کی پے در پے قربانیاں، جنگوں اور مہموں میں عملی شرکت، مسجد نبوی میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں ان کی آزادانہ شرکت، یہاں تک کہ عورتوں کے خصوصی مسائل پر گفتگو کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی نسواں مجالس کے قیام کی منظوری، یہ سب کچھ ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں جس میں عورت حالات حاضرہ سے نابلد اور علم سے بے بہرہ باورچی خانے تک محدود رہنے والی کوئی مخلوق نہیں ہے۔ بلکہ ہر لمحہ جاری جدوجہد میں پوری طرح شریک و سہیم ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں جو چند باتیں کہیں ان میں عورتوں کے حقوق کا بھی خاص طور پر ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ بھی پسند نہ تھا کہ کوئی عورت اپنی مرضی کے بغیر کسی کے نکاح میں بھیج دی جائے۔ بھلا جس رسول نے عورت کو زندہ درگور کرنے کی رسم کا خاتمہ کیا ہو اسے بھلا یہ کب گوارہ ہوسکتا تھا کہ عورت کو اس کی مرضی کے بغیر کسی کے نکاح میں دے کر اسے سماجی اور نفسیاتی طور پر زندہ درگور کردیا جائے۔

عائشہ کہتی ہیں کہ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے کہ وہ اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا کو بھی شوہر کے انتخاب کی آزادی دیتے ہیں اور دوسرے طرف ہمارا نام نہاد مسلم معاشرہ ہے جس میں بڑے بڑے روایتی اللہ والے اپنی بیٹیوں پر ان کی مرضی کے خلاف شادیاں تھوپ کر اسے عین اسلامی عمل سمجھتے ہیں۔ فکر و نظر کے فساد نے آج مسلم معاشرہ میں عورت کا جو رول متعین کردیا ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

عائشہ کہتی ہیں کہ ایک انقلابی رسول کی امت میں مسلم خواتین پر ایک ایسی صورت حال طاری ہوجائے گی کہ وہ معاشرے میں اپنا رول کھودے گی۔ کل اس کا تصور بھی محال تھا لیکن آج بند، ملفوف، بے زبان عورت اسلامی انقلابی سرگرمیوں سے دور بہت دور کردی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اب اسے اپنے اصل رول کا خیال بھی کم ہی آتا ہے۔ اور اگر کبھی کسی دبی کچلی مظلوم عورت نے آواز بھی بلند کرنے کی کوشش کی تو اسے مسلم پرسنل لا اور شریعت کا حوالہ دے کر خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ہمارے مذہبی رہنما یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شریعت کی خوشی اسی میں ہے کہ تم ظلم سہتی رہو۔ برداشت کرو کہ اس سے تمہارا رب خوش ہوجائے گا

عائشہ کہتی ہیں کہ اس رویے کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں کہ اگر ایسا صحیح ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بریرہ رضی اللہ تعالی عنہا کو نکاح فسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش سے باز رکھتے۔

بیجنگ کی کانفرنس سے عائشہ ایک نیا اعتماد لے کر لوٹی ہیں۔ امریکی خاتون اول ہلیری کلنٹن کی اس بات پر کہ حقوق نسواں دراصل انسانی حقوق ہے جب اجلاس تالیاں اور نعروں سے گونجنے لگا تو معاً عائشہ کو یہ خیال آیا کہ اگر ایسا ہے تو قانونی طور پر مسلم خواتین ان حقوق کو اسلام کے توسط سے حاصل کرچکی ہیں۔ رہا ان کے انطباق کا مسئلہ تو اس سلسلے میں ابھی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اس طویل تاریخی سفر میں اسلام کے اوپر جو روایات کی گرد پڑگئی ہے اور جن اقدار کو غلطی سے اسلامی اقدار سمجھا جانے لگا ہے اس کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے اور اسے کتاب و سنت کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جائے۔